ڈاکٹر محمد رفیع الدین

اسلام

کا

نظریۂ تعلیم

ادارۂ ثقافت اسلامیہ
کلب روڈ - لاہور

اسلام کا نظریہ تعلیم

از

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

اے بعشقِ دیگراں دل باختہ
آبروئے خویش را نشناختہ

اِسلام کا نظریۂ تعلیم

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

طبع اول ، ۱۹۵۵
طبع دوم ، ۱۹۷۵

محمد اشرف ڈار (اعزازی معتمد و مشیر مطبوعات) نے
اشرف پریس، لاہور میں باہتمام شیخ محمد اشرف
چھپوا کر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے شائع کیا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہمارے اکثر ماہرینِ تعلیم کا خیال ہے کہ مذہب کو تعلیم سے الگ رہنا چاہیے۔

مذہب اور تعلیم کا افتراق مغربی تصور ہے

اگر ان میں سے بعض علمی طور پر مذہب اور تعلیم کے اتحاد کی حمایت بھی کرتے ہیں تو فقط اس خیال سے کہ مذہب کے معاملے میں عوام کے جذبات اور رجحانات کی مخالفت ممکن نہیں ورنہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ اصولی طور پر مذہب کا تعلیم سے کوئی علاقہ نہیں۔ یقیناً انھوں نے اپنا یہ خیال مغرب کے ماہرینِ تعلیم سے مستعار لیا ہے کیونکہ مغرب کے ماہرینِ تعلیم بھی اصولی طور پر مذہب اور تعلیم کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کے حامی ہیں۔ چنانچہ مغرب کے تعلیمی اداروں میں کہیں بھی مذہب نصابِ تعلیم کا جز نہیں۔

مغربی فکر کا تتبع ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ گو یہ صحیح ہے کہ ہر مغربی تصور غلط نہیں ہوتا۔ لیکن مدت سے ہماری یہ حالت ہے کہ ہم مغرب کے سیاسی اور علمی تفوق سے مرعوب ہیں اور مغربی افکار و آرا کو تنقید اور تحقیق کے بغیر قبول کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ شاید اس میں ہمارا قصور بھی نہیں کیونکہ مغرب کے افکار و آرا ایک سیلاب کی مانند ہیں،

جس میں دنیا کی ہر قوم بہتی چلی جا رہی ہے اور ہم بھی ان کے ساتھ اس سیلاب میں بے اختیار بہ رہے ہیں۔

لیکن تعلیم کا معاملہ اس قدر اہم ہے کہ ہمیں کچھ سنبھلنے کی کوشش کرنی چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ اگر ہم اس ملک میں اپنا نظامِ تعلیم مرتب کرتے ہوئے مذہب کو تعلیم سے الگ رکھیں تو کیا خالص علمی اور عقلی نقطۂ نظر سے ہمارے پاس اس کے لیے کوئی وجہ جواز بھی موجود ہوگی۔ یا ہم فقط مغربی حکما کی تقلید کر رہے ہوں گے۔ اس خیال سے کہ یہ لوگ جو بات کہتے ہیں صحیح ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم مذہب اور تعلیم کے افتراق کے اصول کو سارے تعصبات سے الگ ہو کر محض علم اور عقل کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کریں تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ اصول قطعاً غلط ہے اور مغربی قومیں اسے فقط اپنے مخصوص حالات اور اپنی مخصوص تاریخی اور ذہنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی بنا پر ایک بلند پایہ علمی اصول سمجھنے اور عملی طور پر اسے اختیار کرنے کے لیے مجبور ہوئی ہیں۔

نظریۂ تعلیم فطرتِ انسانی کے نظریہ کا ایک جزء ہے

ہمارے یہ ماہرینِ تعلیم اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ فلسفۂ تعلیم علم کا کوئی الگ شعبہ نہیں جو آزادانہ علمی تحقیق اور عقلی استدلال کی بنا پر قائم کیا گیا ہو بلکہ وہ فلسفۂ اخلاق اور فلسفۂ سیاست کی طرح ہمارے نظریۂ انسان و کائنات کا ایک عکس ہوتا ہے۔ لوگ انسان اور کائنات کا جو تصور قائم کرتے ہیں اپنا نظریۂ تعلیم بھی اسی سے اخذ کرتے ہیں۔

وہ انسانی زندگی کا جو مقصد قرار دیتے ہیں اپنی تعلیم کا مقصد بھی وہی تجویز کرتے ہیں۔ ہر قوم کا نظریۂ زندگی الگ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر قوم کا نظریۂ تعلیم بھی الگ ہوتا ہے۔ چونکہ نظریاتِ عالم بہت سے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ نظریاتِ تعلیم بھی بہت سے ہوں، جس طرح نظریاتِ زندگی سب صحیح نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ان میں سے صرف ایک صحیح ہو سکتا ہے اور وہ وہی ہوگا جو صحیح نظریۂ زندگی پر مبنی ہوگا۔ جب تک ہمارا نظریۂ زندگی صحیح نہ ہو ہم زندگی کا صحیح مقصد نہیں جان سکتے اور نہ تعلیم کا صحیح مقصد معین کر سکتے ہیں۔ دراصل نظریۂ زندگی، نظریۂ کائنات، مقصدِ زندگی اور مقصدِ تعلیم ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں جسے ہم کبھی مختصر طور پر بیان کر دیتے ہیں اور کبھی مفصل طور پر، اور ان کا عقدہ حقیقتِ انسان کے علم سے وا ہوتا ہے۔ اگر ہم جان لیں کہ انسان کی فطرت کیا ہے تو گویا ہم نے جان لیا کہ صحیح نظریۂ کائنات صحیح نظریۂ زندگی، صحیح مقصدِ زندگی یا صحیح مقصدِ تعلیم کیا ہے۔ تو پھر کیا فطرتِ انسانی کو ٹھیک طرح سے سمجھنے کے لیے ہم مغرب کے حکیموں اور داناؤں کو اپنا رہنما بنائیں؟ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ اگر مغرب کے سارے دانا اور حکیم اس معاملہ میں ہماری راہ نمائی کر سکیں تو ہم خوشی سے ان کی راہ نمائی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن وہ بیچارے تو خود شاکی ہیں کہ فطرتِ انسانی کے متعلق ان کی واقفیت خطرناک حد تک محدود ہے۔ میکڈوگل (McDougall) جیسا نامور ماہرِ نفسیات لکھتا ہے:

مغربی حکما کی فطرتِ انسانی سے لاعلمی

"انسان کی فطرت کے متعلق ہماری عدم واقفیت نے آج تک تمام جماعتی علوم کی نشوونما کو رد کا ہوا ہے۔ یہ علوم ہمارے زمانے میں ایک ایسی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں، جس کے لیے دنیا چلا رہی ہے ان کے بغیر ہماری تہذیب نہ صرف زوال بلکہ فنا کے شدید خطرہ سے دوچار ہے۔

"میرا ادعا یہ ہے کہ اپنی تہذیب کے ترانہ کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیں انسان کی فطرت اور سوسائٹی کی زندگی کے متعلق اس سے بہت زیادہ علم (ایک منظم علم) کی ضرورت ہے جو ہمیں اس وقت حاصل ہے۔

پس ہماری تہذیب کی غیر متیقن اور بڑھتی ہوئی خطرناک حالت کا صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں سرعت کے ساتھ اجتماعی علوم کو سچ سچ کے علوم کی شکل دینی چاہیے اور اس غرض کے لیے پہلے انسان کی فطرت اور اس کے اعمال و افعال کے متعلق ایک منظم واقفیت بہم پہنچانی چاہیے۔

"پس علمی صورت میں اس کا علاج کیا ہے؟ میں اس سوال کے مختصر جواب کے طور پر یہ بتاؤں گا کہ اگر میں ڈکٹیٹر بن جاؤں تو کیا کروں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ہر ممکن طریق سے اپنی قوم کے ذہین ترین افراد کو مادی علوم سے ہٹا کر انسانی اور اجتماعی علوم کی جستجو پر مقرر کر دوں۔"

امریکہ کا ایک مشہور سائنسدان ڈاکٹر روگر جے ولیمز (Dr Roger J. Williams) دنیا بھر میں سائنس دانوں کی سب سے بڑی انجمن اے اے اے ایس (A. A. A. S.) میں تقریر کرتے ہوئے کہتا ہے:

"پچھلے ایک سو سال میں سائنس نے علم صنعت میں ایک انقلاب پیدا کیا ہے۔

اب اسے انسانی مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ سائنس دان سوسائٹی کے سالم یعنی فرد انسانی کے متعلق وہ معلومات حاصل نہیں کر سکے جو انھوں نے مادہ کے سالمہ کے متعلق بہم پہنچائی ہیں۔ اب ہمیں ساری توجہ اس حقیقت کی دریافت میں صرف کرنی چاہیے کہ انسان کیا ہے؟ آج ہم اپنی جس کمی کو سب سے زیادہ محسوس کر رہے ہیں وہ اس بات کی لاعلمی ہے کہ لوگ کیا ہیں، یعنی کہ انسان جو اس کرۂ زمین پر بستے ہیں کیا ہیں۔ آج ہماری تہذیب کو سالمہ کے بم سے یا جراثیم کی جنگ سے فنا ہونے کا خطرہ نہیں۔ بلکہ ہم اس کے لیے خود ایک خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اپنی بدبختی کے لیے ایٹم بم کو مجرم ٹھہرائیں تو ہم اس نادان لڑکے کی طرح ہوں گے جو بائیسکل سے گر جانے کے بعد اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے بائیسکل کو جوتے کی ٹھوکر لگاتا ہے۔ اگر ہماری تہذیب مٹ گئی تو وہ آلات یا اسلحہ جو انسان کام میں لائے گا، اس کی بربادی کا موجب نہ ہوں گے بلکہ انسان خود ہی اپنی ہلاکت کا موجب ہوگا۔"

مقصدِ تعلیم کے تعین کے مسئلہ میں حکمائے مغرب کی پریشان خیالی

یورپ کے محققین ہماری ریاضیات، طبیعیات اور حیاتیات ایسے علوم میں بے شک کچھ راہ نمائی کر سکتے ہیں لیکن انسانی اور اجتماعی علوم جن کی تدوین اور تنظیم کا دار و مدار فطرتِ انسانی کے صحیح نظریہ پر ہے اور جن میں فلسفۂ تعلیم بھی شامل ہے ان کے اپنے ہی اعتراف کے مطابق ان کی دسترس سے باہر ہیں جب یہ لوگ انسان کی حقیقت کے متعلق واضح طور پر کچھ نہیں جانتے تو وہ کیونکر جان سکتے ہیں کہ انسان کی زندگی کا مقصد یا تعلیم کا مقصد کیا ہے اور جب ان کو تعلیم کا مقصد ہی معلوم نہ ہو تو تعلیمی معاملات کے متعلق

ان کی رائے کی وقعت کیا ہو سکتی ہے اور ہمارے لیے کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ ہم ان کی رائے کو وقیع سمجھیں۔

یورپ کے حکمائے تعلیم نے مقصدِ تعلیم کے متعلق جو رائے زنی کی ہے، اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس موضوع پر ان کے خیالات کس قدر منتشر ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ تعلیم کا مقصد سیرت کی تعمیر ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ایک مکمل زندگی بسر کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ تیسرے کے خیال کے مطابق اس کا مقصد ایک تندرست جسم میں ایک تندرست روح پیدا کرتا ہے۔ چوتھے کی رائے کے مطابق تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی فطرت کے اعلیٰ ترین ممکنات کو ظہور میں لایا جائے۔

لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ سیرت کی تعمیر کس طرح ہوتی ہے اور تعمیر شدہ سیرت کے لوازمات کیا ہیں یا ایک مکمل زندگی کسے کہتے ہیں اور اس کے بسر کرنے کے طریقے کیا ہیں یا ایک تندرست جسم میں ایک تندرست جان کس طرح پیدا ہوتی ہے، اور ایک تندرست جان سے مراد کیا ہے، یا انسان کی فطرت کے اعلیٰ ترین ممکنات کیا ہیں؟ اور ان کا ظہور کس طرح ہوتا ہے تو ان کے جوابات ایک دوسرے کے اس قدر مخالف ہوتے ہیں کہ کوئی کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ آخر تعلیم کا مقصد کیا قرار دیا جائے۔ ڈاکٹر کیٹنگ (Dr Keatinge) سچ کہتا ہے کہ تعلیم کے مقصد کا تعین کرنے کی یہ تمام کوششیں بے فائدہ ہیں کیونکہ ہر شخص ان کی طرف جو مطلب چاہے منسوب کر لیتا ہے۔

انگلستان کے ایک نامور ماہرِ تعلیم سر پرسی نن (Sir Percy Nunn)

سر پرسی نن کی تعریف کے نقائص

نے آخر اپنی مشہور کتاب "ایجوکیشن اٹس ڈیٹا اینڈ فرسٹ پرنسپلز" Education : Its Data and First Principles میں کوشش کی کہ وہ مقصدِ تعلیم کی ان تعریفوں سے بالاتر ہو کر کوئی ایسی تعریف کرے جو ان کے نقائص سے مبرا ہو۔ چنانچہ بڑے سوچ بچار کے بعد اس نے جو تعریف کی وہ یہ تھی کہ تعلیم کا مقصد انسان کی انفرادیت (individuality) کی آزادانہ نشو و نما ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو سر پرسی نن کی یہ تعریف بھی ایسی ہی مہمل اور بیکار ہے جیسی کہ دوسری اوپر بیان کی ہوئی تعریفیں۔ اس لیے کہ سر پرسی نن اپنی ساری کتاب میں کہیں نہیں بتاتا کہ انفرادیت سے اس کی مراد کیا ہے؟ اور انفرادیت کی آزادانہ نشو و نما کیونکر ہوتی ہے؟ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریز اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ روسی کی انفرادیت کی نشو و نما ایک جیسی ہوتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ نیکی، فرض شناسی، انصاف، سچائی، آزادی اور اس جیسی دوسری اقدارِ حیات کے متعلق دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں بُعد المشرقین موجود ہے۔ یہاں تک کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو نیکی، فرض شناسی، انصاف، آزادی اور سچائی کے اوصاف سے بے بہرہ سمجھتا ہے۔ اگر ان کی انفرادیت کی نشو و نما ایک جیسی نہیں ہوتی، تو فرق آ کر کہاں پڑتا ہے اور کیوں دونوں میں سے ہر ایک دوسرے پہ الزام رکھتا ہے کہ اس کی انفرادیت کی نشو و نما آزادانہ طور پر نہیں ہوئی۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں حکمران

طبقہ کے سوا سب لوگ غلام ہوتے ہیں اور اسی طرح سے سرمایہ دار کہتے ہیں کہ اشتراکی نظام میں حکمران طبقہ کے سوا باقی سب لوگ غلام ہوتے ہیں۔ اگر یہ اصول صحیح تسلیم کر لیا جائے (جیسا کہ وہ فی الواقع صحیح اور قابلِ تسلیم ہے) کہ ہر آزاد انسان اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنی مرضی سے اپنے آپ پر پابندیاں عائد کرتا ہے اور مرضی سے عائد کی ہوئی پابندیاں اس کی آزادی میں خلل پیدا نہیں کرتیں تو پھر اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس کیا اصول ہے کہ سچی آزادی کس کی ہے اور جھوٹی آزادی کس کی ہے۔ سر پرسی نن اس کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔

سر پرسی نن یہ تسلیم کرتا ہے کہ جب تک ہم زندگی کا نصب العین معین نہ کریں، ہم تعلیم کا نصب العین معین نہیں کر سکتے۔ اس سے ہم امید کر سکتے تھے کہ وہ ہمیں زندگی کا اور تعلیم کا کوئی ایسا نصب العین بتائے گا جس سے ماہرِ تعلیم کو صحیح راہ نمائی حاصل ہو سکے گی اور جو انفرادیت کی اس آزادانہ نشوونما کا ضامن ہو گا جس کا وہ خواہش مند ہے لیکن زندگی یا تعلیم کا کوئی صحیح نصب العین معین کرنے کی بجائے وہ ایک ایسی بات کہتا ہے جو اس کی شہرت کے ایک ماہرِ تعلیم کی شایان شان نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ نہ تو زندگی کا کوئی مخصوص نصب العین ہونا چاہیے اور نہ تعلیم کا، بلکہ ہر فرد بشر آزاد ہے کہ اپنی زندگی اور اپنی تعلیم کے لیے جو نصب العین چاہے اختیار کرے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"تمام اشخاص کے لیے تعلیم کا کوئی ایسا نصب العین مقرر نہیں کیا جا سکتا

جو زندگی کے کسی خاص نصب العین کے تحت ہو، کیونکہ دنیا میں اتنے ہی نصب العین ہیں جتنے کہ اشخاص"

ایک مخصوص نصب العین کی تعلیم سے نجات نہیں

مصنف کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر تعلیم کا کوئی مخصوص نصب العین مقرر کیا گیا تو اس سے طالب علم کی آزادی میں فرق آئے گا اور اس کی انفرادیت کی آزادانہ نشوونما نہ ہو سکے گی۔ لیکن ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا کسی نظامِ تعلیم میں یہ ممکن ہے کہ طالب علم کو ہر ایک نصب العین کے اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ ہر نظامِ تعلیم کسی قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی قوم ایسی ہے، جس کے افراد کا کوئی مشترک نصب العین نہ ہو اور جس کے افراد میں سے ہر ایک اپنا اپنا الگ نصب العین رکھتا ہو۔ اگر کوئی قوم ایسی ہے تو وہ افراد کے اتحاد کے بغیر وجود میں نہیں آئی، پھر وہ کونسا تصور یا عقیدہ ہے جو اس کے افراد کو متحد اور منظم کر کے اسے ایک قوم کی شکل دیتا ہے اور ان کے فکر و عمل کے تمام شعبوں میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی عقیدہ ایسا ہے تو وہی ان کی زندگی اور ان کی تعلیم کا نصب العین ہے اور اگر ان کے ہاں ایسا تصور یا عقیدہ کوئی نہیں تو پھر ظاہر ہے کہ وہ قوم ایک قوم نہیں ہو گی، بلکہ ایسے افراد کی ایک بھیڑ ہو گی جو زندگی کے کسی شعبہ میں متحد نہ ہو سکتے ہوں۔ لیکن افراد کی ایسی بھیڑ دنیا میں کہیں موجود نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔ جونہی انسان حیوانی بہیمیت کی سطح سے بلند ہو کر انسانی تہذیب کی سطح پر قدم رکھتا ہے وہ اپنے ہم خیال اور ہم عقیدہ لوگوں سے

مل کر ایک جماعت بناتا ہے۔ نصب العینِ حیات کی بنا پر جماعت بندی کرنا انسان کی فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں دنیا میں نصب العینی جماعتیں نظر آتی ہیں، نصب العینی افراد نظر نہیں آتے۔ جب ہر قوم ایک مخصوص نصب العین کے ماتحت اپنی ساری زندگی بسر کرتی ہے تو کس طرح یہ ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسا نظامِ تعلیم کھڑا کر دے جو کسی نصب العینِ حیات کی پیداوار نہ ہو۔ ایسا نظامِ تعلیم اس کی کونسی ضرورت کو پورا کرے گا؟

ہر نظامِ تعلیم ہمیشہ ایک بڑے نظام کا جز ہوتا ہے جس کے بغیر اور جس سے الگ وہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا اور یہ نظامِ ریاست ہوتا ہے اور ہر ریاست ایک مخصوص نصب العینِ حیات پر مبنی ہوتی ہے ورنہ وہ معرضِ وجود میں نہیں آ سکتی۔ لہٰذا اگر کسی مخصوص نصب العین کو براہِ راست اور جان بوجھ کر نظامِ تعلیم میں داخل نہ بھی کیا جائے تب بھی وہ ایک مخصوص نصب العین پر قائم ہو جاتا ہے اور وہ وہی نصب العین ہوتا ہے جو اس کے بنانے اور چلانے والوں کا نصب العین اور ان کی قوم کا نصب العین ہوتا ہے اور پھر وہی نصب العین استادوں، پروفیسروں، مدرسہ کے مینیجروں، ہیڈ ماسٹروں، پرنسپلوں، انسپکٹروں، ڈائرکٹروں اور نصاب کے مولفوں کی ذہنیت کے ذریعہ سے پہلے مدرسہ کی ساری فضا پر اور پھر اس کے ذریعہ سے طالب علم کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور پھر وہ نصب العین جو اس نظامِ تعلیم کو وجود میں لاتا ہو، چونکہ پوری قوم کا نصب العین ہوتا ہے اس لیے وہ طالب علم کو مدرسہ کی فضا سے باہر بھی گھر، بازار اور سماج کے

ذریعے متاثر کرتا رہتا ہے۔ اگر طالب علم اس نصب العین کے اثرات سے بچ جائے اور اس کے دل میں اس کی شدید محبت پیدا نہ ہو جائے تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوگا کہ جب تک وہ مدرسے کے اندر اور مدرسے سے باہر رہا ہے یعنی ہر آن اور ہر لمحہ اس کے حواس اور ذہنی قوی کلی طور پر بیکار رہے ہیں اور اس کے لیے دیکھنا، سننا، محسوس کرنا سوچنا اور سمجھنا ممکن نہیں ہوا۔ اگر ان دھیمے اور خاموش لیکن یقینی، قوی اور ناقابلِ انسداد مخصوص نصب العینی اثرات کے باوجود کوئی ماہرِ تعلیم یہ سمجھتا ہے کہ اس نے طالب علم کو ایک مخصوص نصب العین کی تعلیم نہیں دی تو اس سے زیادہ بے خبری اور غلط فہمی اور کیا ہو گی۔

جب ایک مخصوص نصب العین کی تعلیم کے بغیر چارہ نہیں تو پھر ضروری ہے کہ ماہرِ تعلیم یہ دیکھے کہ جو مخصوص نصب العین طالب علم کی تعلیم و تربیت کی بنیاد بننے والا ہے وہ اچھا ہے یا برا۔ اور اگر برا ہے تو طالب علم کو اس کے اثرات سے محفوظ کرنے کا انتظام کرے۔ لیکن وہ ایک برے اور ناقص نصب العین کے اثرات کو اس وقت تک روک نہیں سکتا جب تک کہ وہ ایک اچھے نصب العین کے اثرات کو ان کی بجائے معرضِ عمل میں نہ لائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ایک سوچا سمجھا ہوا مخصوص نصب العین اس کے سامنے رکھے۔ تعلیم ایک مثبت عمل ہے منفی عمل نہیں معلم کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ طالب علم کو کہے کہ "یہ کرو" یہ نہ کہے کہ "یہ نہ کرو"۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم فیصلہ کریں کہ ہمیں طالب علم کو کس مخصوص

نصب العین کے تحت تربیت دینا چاہیے۔

سر پرسی نن کا ایک عجیب خیال

سر پرسی نن کا یہ خیال بھی عجیب و غریب ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ خواہ فرد زندگی یا تعلیم کا کوئی نصب العین اختیار کرے اس کی انفرادیت کی نشوونما ایک ہی جیسی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اوپر کی مثال میں ایک تعلیم یافتہ انگریز اور ایک تعلیم یافتہ روسی کی انفرادیت کی نشوونما ایک جیسی نہیں ہوئی، ورنہ اقدار حیات کے متعلق ان کے نقطۂ نظر میں تضاد نہ ہوتا۔ لہٰذا اگر دونوں میں سے ایک کی انفرادیت کی نشوونما صحیح طور پر ہوئی ہے تو دوسرے کی صحیح طور پر نہیں ہوئی۔ اگر مخالف اور متضاد سمتوں میں بھی انفرادیت کی نشوونما ایک ہی جیسی ہوتی ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ سر پرسی نن کے نزدیک انفرادیت کی نشوونما کے معنی کیا ہیں؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر پرسی نن کا خیال یہ ہے کہ جس نصب العین کو بھی آزادانہ طور پر اختیار کر لیا جائے وہ صحیح ہوتا ہے، گویا آزادانہ اختیار ایک معجزہ عمل میں آتا ہے جس سے ایک غلط نصب العین خود بخود صحیح ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے کہا ہوتا کہ اگر ایک غلط نصب العین اختیار کر لیا جائے گا، تو چونکہ اس کی خامیاں کچھ مدت کے بعد آشکار ہو جائیں گی۔ اس کا اختیار کرنے والا خود بخود مجبور ہوگا کہ اسے ترک کر کے ایک اور نصب العین اختیار کرے اور اس طرح آخر کار وہ صحیح نصب العین تک پہنچ جائے گا۔ لہٰذا کسی بیرونی مداخلت کی ضرورت نہیں تو بات سمجھ میں آ سکتی تھی لیکن وہ یہ نہیں کہتا، بلکہ وہ اس بات کو خوب سمجھتا ہے کہ معلم کے لیے ہرگز ممکن نہیں کہ اپنے

شاگردوں کو تجربات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے اور پھر توقع رکھے کہ وہ اپنی راہنمائی خود بخود کریں گے۔ چنانچہ اخلاقیات کی تعلیم کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

"اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بچوں کے فطری رجحانات نیکی کی طرف ایک طبعی میلان رکھتے ہیں لیکن ان سے یہ توقع رکھنا غلط ہے کہ وہ زندگی کے ان مشکل مسائل کو جنہیں حل کرنے سے بعض مخلص ترین اشخاص اور دنیا کی لائق ترین قومیں عاجز رہی ہیں، کسی بیرونی امداد کے بغیر خود بخود حل کر لیں گے۔ ضروری ہے کہ ایسی ہستیاں جن کی فطرت کا بنیادی تقاضا تخلیقی کوششوں کی توسیع ہے آخر کار نیکی کی جستجو کریں اور جب تک اسے پا نہ لیں چین سے نہ بیٹھیں لیکن شعور انسانی کی الم ناک تاریخ اور اپنے آپ پر توجہ انسانی کے مظالم کی افسوس ناک داستان ظاہر کرتی ہے کہ یہ جستجو کس قدر غیر یقینی ہے اور کس کثرت کے ساتھ اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔"

لیکن اگر مصنف کا خیال یہی ہے کہ اخلاقیات کی تعلیم کے سلسلے میں طالب علم کو بیرونی امداد کی ضرورت ہے تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ یہ بیرونی امداد کس قسم کے اخلاق کی طرف راہنمائی کرے گی۔ ہر شخص کے فرض کا مفہوم الگ ہے۔ نیکی ایک اضافی چیز ہے اور اس کے مفہوم کا دارومدار زندگی کے اس نصب العین پر ہوتا ہے جس سے وہ اخذ کیا جائے۔ ہر نصب العین کی نیکی الگ ہوتی ہے تو پھر ہم طالب علم کو کون سی نیکی کی تعلیم دیں۔ اگر ہم اس بات کا فیصلہ معلم پر چھوڑ دیں تو کیا ہم یقین کر سکتے ہیں کہ معلم کا نصب العین

اور اس سے پیدا ہونے والا نیکی کا تصور ہر حالت میں صحیح ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ہر معلم کا نصب العین حیات اور نیکی کا تصور الگ ہو۔ جب سر پرسی نن مجبور ہو کر طالب علم کی بیرونی راہنمائی کے لیے نیکی کا کوئی معیار یا مفہوم مقرر کریں گے تو وہ طالب علموں پر ایک مخصوص نظریۂ حیات مسلط کرنے کا وہی انتظام کر دیں گے جس سے وہ گھبرا رہے ہیں۔

غرض سر پرسی نن کا یہ خیال درست نہیں کہ نہ زندگی کا کوئی مخصوص نصب العین ہونا چاہیے اور نہ تعلیم کا۔ کیونکہ ایک مخصوص نصب العین کی تعلیم سے گریز کسی حالت میں بھی ممکن نہیں۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ اس مخصوص نصب العین کا انتخاب طالب علم کے غیر تربیت یافتہ اور ناقابل اعتماد رجحانات یا اتفاقات پر چھوڑ دیا جائے اور پھر کبھی وہ اچھا ہو اور کبھی برا، یہ بہتر ہے کہ ماہر تعلیم خود پورے سوچ بچار سے اس کے لیے ایک خاص نصب العین منتخب کر دے تاکہ اسی نصب العین کا اثر سارے نظام تعلیم میں سرایت کرے اور وہی طالب علم کے ذہن پر مسلط ہو اور کوئی دوسرا نصب العین جسے وہ غلط یا ناکافی سمجھتا ہے اس کی جگہ نہ لے لے۔ اگر ہم اپنے نظام تعلیم کو جان بوجھ کر کسی اچھے نصب العین پر قائم نہیں کریں گے تو وہ خود بخود کسی بُرے نصب العین پر مبنی ہو جائے گا جس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوگی۔ یہ حقیقت اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ تعلیم کے بارے میں غیر جانبدار رہنا ناممکن ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ تعلیم کا اچھا راستہ اختیار کریں، یا برا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسرا راستہ جو نہ اچھا ہو

نہ برا ممکن نہیں۔

صحیح نصب العین حیات کی دریافت کے بغیر چارہ نہیں

دراصل سر پرسی نن اور اس جیسے دوسرے مغربی ماہرین تعلیم کو دقت یہ ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ مختلف نصب العینوں میں سے صحیح نصب العین کسے قرار دیا جائے اور کیوں۔ ہر قوم کہے گی کہ ہمارا نصب العین صحیح ہے اور جب تک ہمارے اچھے اور برے نصب العینوں میں امتیاز کرنے کے لیے کوئی معقول علمی معیار نہ ہو ہم کسی کے دعوے کی تردید نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انھوں نے اس مشکل کا حل یہ نکالا ہے کہ ہر شخص کو اجازت دے دی جائے کہ وہ جو نصب العین چاہے اختیار کرے۔ لیکن اس نقطۂ نظر سے جو بیہودہ نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ اسے مہمل ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اگر سر پرسی نن اور اس جیسے دوسرے لوگوں کو صحیح نصب العین حیات یا صحیح نصب العین تعلیم معلوم نہیں تو اس مشکل کا حل کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہر نصب العین کو صحیح سمجھ لیا جائے جبکہ یہ اظہر من الشمس ہے کہ ہر نصب العین نہ صحیح ہوتا ہے اور نہ صحیح ہو سکتا ہے۔

اگر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ زندگی کا کوئی نہ کوئی نصب العین رکھے تو ضروری ہے کہ ان مختلف نصب العینوں میں سے جو ممکن ہیں ایک نصب العین صحیح بھی ہو اور صحیح نصب العین صرف ایک ہی ہو۔ انسان صحیح نصب العین کو چاہتا ہے، غلط کو نہیں چاہتا۔ جونہی کہ اس کو معلوم ہو جائے کہ اس کا نصب العین غلط ہے یا اس میں کوئی نقص یا خامی ہے، تو وہ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کرتا اور اسے فوراً ترک کرنے کے لیے تیار ہو جاتا

ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی کہے کہ حضرت! سب نصب العین ایک جیسے ہیں۔ اسی سے چمٹے رہیے تو وہ اس کو ماننے کے آمادہ نہیں ہوتا۔ گویا صحیح نصب العین انسان کی فطرت کی ایک شدید ضرورت ہے۔

انسان کی کوئی شدید ضرورت ایسی نہیں جس کی تکمیل کا انتظام کارخانۂ قدرت میں موجود نہ ہو اور جستجو سے مہیا نہ ہو سکتا ہو۔ لہٰذا صحیح نصب العین نہ صرف ممکن ہے بلکہ تلاش سے دریافت کیا جا سکتا ہے اور اس کا تلاش کرنا عقلی اعتبار سے نہ صرف جائز ہے بلکہ ہمارا اولین فرض ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر ہر فردِ بشر کا اپنا نصب العین الگ ہو اور نصب العین اتنے ہی ہوں جتنے افراد ہیں تو پھر یا تو نصب العین ایک بے حقیقت اور بے معنی چیز ہوگی جو انسان کی عملی زندگی پر کوئی اثر پیدا نہیں کرتی اور یا دنیا میں ہر طرف بدامنی اور انتشار کا دور دورہ ہوگا۔ کس طرح یہ ممکن ہے کہ انفرادیت کی نشو و نما مختلف اور متضاد سمتوں میں بھی ایک ہی جیسی ہو۔ جب ہر انسان کی فطرت ایک ہی ہے تو پھر سب کے لیے ایک ہی نصب العین کیوں ممکن نہ ہو۔ یہ صحیح ہے کہ جب ہم ساری نوعِ انسانی کے لیے ایک ہی نصب العین کا فیصلہ کریں گے تو چونکہ ہر انسان کی انفرادیت بے مثل اور بے نظیر ہے، اس لیے ہر انسان اس کی جستجو اور تکمیل اور تحصیل اپنے خاص ڈھنگ سے کرے گا اور اس دوران میں اپنے مخصوص میلانات و ممکنات کو کام میں لائے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہوگا کہ ہر فردِ بشر کا نصب العین الگ ہے۔ سر پرسی نن خود تسلیم کرتا ہے کہ تفصیلات کی بوقلمونی اور رنگا رنگی ایک مجموعی اور بنیادی

وحدت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ اس بات کے باوجود کہ ایک درخت کے سیب ایک جیسے ہوتے ہیں، ان کے رنگ، حجم، شکل اور ذائقہ میں معمولی سا اختلاف ہو سکتا ہے۔ سو مختلف شاعروں میں سے ہر ایک جو سانیٹ (Sonnet) لکھے گا وہ اپنی مجموعی حیثیت میں بے مثل اور بے نظیر ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ہو سکتا ہے کہ ان سب کا موضوع ایک ہی ہو۔ مثلاً انگلستان کی محبت۔

انسانی علوم کی تحقیق کے راستہ میں حکمائے مغرب کی بڑی رکاوٹ

فلسفۂ تعلیم اور اس جیسے دوسرے انسانی اور اجتماعی علوم کی صحیح تحقیق کے راستے میں جو چیز حکمائے مغرب کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ انسان کی مادی توجیہ کرتے ہیں اور کوشش کے باوجود اس نقطۂ نظر سے نجات پانے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنی علمی بحثوں میں کہیں خدا کا نام لے لیا تو علمی نقطۂ نگاہ سے ہماری بحث گھٹیا ہو جائے گی اور معیار سے گر جائے گی۔ ان کے علمی اور عقلی نظریات میں خدا کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

ڈارون (Darwin) کے نظریۂ ارتقا کے تتبع میں وہ سمجھتے ہیں کہ انسان مادہ سے ترقی کر کے موجودہ حالت کو پہنچا ہے۔ یہ باور کرنے کے لیے ان کے پاس ڈارون کے نظریہ کا علمی سہارا ہے جسے وہ غلط قرار دیں تو کس بنا پر اور چھوڑ دیں تو کہاں جائیں۔ لہٰذا وہ سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے

مادہ تھا۔ پھر اس میں کائنات کی میکانکی قوتوں کے عمل سے تغیر پیدا ہوا تو حیوان وجود میں آیا جس کا امتیازی وصف اس کی جبلتی خواہشات ہیں۔ پھر حیوانی جبلتوں سے کسی نہ کسی طرح وہ ذہنی اوصاف یا قوتیں پیدا ہوئے جو انسان سے خاص ہیں اور جو اس کے مخصوص افعال و اعمال کا موجب ہیں۔ مثلاً ضمیر اور عقل و فکر، سیاست، مذہب، فلسفہ، قانون، اخلاق، ہنر وغیرہ وہ مانتے ہیں کہ انسان اپنے ذہنی قویٰ اور اوصاف اور افعال کے لحاظ سے حیوان سے مختلف ہے لیکن ان کے نزدیک ان اوصاف اور افعال کا سبب انسان کی جبلتوں میں تلاش کرنا چاہیے جو انسان اور حیوان میں مشترک ہیں اور جو انسان نے حیوان سے وراثتاً حاصل کی ہیں۔ کیونکہ اگر وہ حیوانی جبلتوں سے پیدا نہیں ہوئے تو پھر کہاں سے آئے ہیں۔

چنانچہ مغرب کا ماہرِ نفسیات جس سے مغرب کا ماہرِ تعلیم فطرتِ انسانی کے متعلق اپنے نظریہ کے اکثر عناصر مستعار لینے پر مجبور ہے، انسان کے ان اعمال کو یا تو ساری جبلتوں کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ مثلاً میکڈوگل (McDougall) اور یا ان میں سے کسی ایک کا مثلاً فرائڈ (Freud) اور ایڈلر (Adler) کے نزدیک انسان کی شخصیت کا بیشتر حصہ اس کا لاشعور ہے جس کے اندر جنسی محبت کا ایک زبردست جذبہ ہے جنسی محبت ایک جبلتی خواہش ہے جو حیوان میں بھی موجود ہے۔ لیکن فرائڈ سمجھتا ہے کہ وہ انسان میں پہنچ کر زیادہ قوی اور معنی خیز ہو جاتی ہے اس کی وجہ کیا ہے، کیا انسان کی نسل جسے قائم رکھنے کے لیے قدرت نے اسے جنسی خواہشات دی

ہیں اس کی ان خواہشات کی غیر معمولی قوت اور معنی خیزی کے بغیر قائم نہ رہ سکتی تھی۔ فرائڈ اس کے متعلق خاموش ہے۔ تاہم وہ کہتا ہے کہ انسان کے شعور کے سارے مشمولات اس کے جنسی جذبہ لاشعور سے آتے ہیں چونکہ انسان سماج کے خوف سے اپنے شرمناک لاشعوری جذبہ جنسیت کو پوری طرح سے مطمئن نہیں کر سکتا لہٰذا وہ اس کے کچھ حصہ کو مذہب، اخلاق، علم، ہنر وغیرہ کی صورت میں تبدیل کر کے مطمئن کرتا ہے۔ بچپن میں لاشعوری جذبہ جنسیت ماں باپ کی جنسی محبت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جسے آبائی الجھاؤ (Oedipus) کہا جاتا ہے۔ بعد میں جب یہ الجھاؤ کمزور ہو جاتا ہے تو زندگی کے نصب العین اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ گویا نصب العینوں کی بنیاد جنسیت (sexuality) ہے۔

ایڈلر (Adler) لاشعوری جذبہ کو تفوق یا استیلا قرار دیتا ہے جو ایک جبلتی خواہش کی حیثیت سے انسان اور حیوان دونوں میں موجود ہے۔ انسان بچپن میں کمزور ہونے کی وجہ سے ایک احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر ساری عمر اس احساس کا علاج کرنے کے لیے بڑی بڑی کوششیں کرتا ہے تاکہ اسے دوسروں پر تفوق اور استیلا حاصل ہو جائے۔ اس کوشش میں وہ زندگی کے بڑے بڑے نصب العینوں کا اختراع کرتا ہے اور ان کی محبت اور جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔

جو لوگ انسان کی حیوانیت کو اعلیٰ ترین نصب العینوں کا منبع اور ماخذ سمجھتے ہیں، ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ زندگی یا تعلیم کا کوئی نصب العین

تعین کریں گے، یا اس کے انتخاب کے لیے کسی ذہنی کاوش سے کام لینا ضروری سمجھیں گے۔

انسان کی اصل خودی ہے

مغربی حکما کے نزدیک انسان کے ارتقا کی ترتیب اس طرح ہے۔ پہلے مادہ، پھر حیوان اور پھر انسان۔ وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ انسان کا ارتقا ایک درخت کی طرح ہوا ہے جس کی نشوونما کی انتہا پر پھول یا بیج پیدا ہو جاتا ہے لیکن وہ غلطی سے درخت کی نشوونما کو تنے سے شروع کرتے ہیں کہ پہلے تنا تھا۔ بعد میں اس سے شاخیں اور پتے پیدا ہوئے اور ان شاخوں اور پتوں سے پھول اور پھول سے بیج۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو فقط درخت کا تنا ہی نظر آتا ہے۔ چونکہ بیج جس سے درخت پھوٹتا ہے، زیرزمین ان کی نظروں سے اوجھل تھا۔ وہ نہیں سمجھتے کہ بیج جو درخت کی نشوونما کا آخری نتیجہ ہے وہی اس کی ابتدا بھی ہے۔

اسی طرح انسان کی خودی (human self-consciousness)۔ حواس کے مخصوص قویٰ اور اوصاف اور افعال کا منبع اور ماخذ ہے اور جس کا ظہور انسان کے ارتقا کا آخری نتیجہ ہے وہی کائنات کی خودی کی صورت میں انسان کی اصل بھی ہے۔ وہ کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھی اس نے اپنے اوصاف کے اظہار کے لیے کائنات کے درخت کو ارتقائی منازل سے گزارا ہے۔ اس ارتقا کے آخری نتیجہ کے طور پر اس درخت میں ایک پھول کا ظہور ہوا ہے جسے ہم انسان کہتے ہیں اور جس میں خودیٔ کائنات کے اوصاف کا عکس موجود ہے:

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

انسان کی حقیقت اس کا مادی جسم یا اس کی حیوانی جبلتیں نہیں۔ نہ ساری جبلتیں اور نہ ان میں سے کوئی ایک جبلت۔ بلکہ اس کا شعور یا اس کی خودی ہے جسم خودی سے پیدا ہوا ہے۔ خودی جسم سے پیدا نہیں ہوتی۔

قالب از ما هست شد نے ما ازو (رومی)

خودیٔ کائنات نے انسانی جسم کو اپنے اوصاف کے نمودار کرنے کے لیے ایک ذریعہ کے طور پر پیدا کیا ہے۔ حیوانی مرحلۂ ارتقا میں جبلتوں کا پیدا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ جسمِ حیوانی جسے انسان کہتے ہیں اور جو اپنے دماغ کی مکمل ساخت کی وجہ سے خودی کے ظہور کا ذریعہ بن سکتا تھا وجود میں آ جائے۔ ہم جسے انسان کہتے ہیں وہ انسان کی خودی ہے۔ ہڈیوں اور پٹھوں اور گوشت اور پوست کا وہ ڈھانچہ نہیں جو اس کا خادم ہے:

اے برادر تو ہمیں اندیشۂ
ما بقی تو پوستی و ریشۂ

اسی انسان کی تعلیم و تربیت ہمارے ماہرینِ تعلیم کے ذمہ ہے۔ انسان کی اعلیٰ ترین سرگرمیاں جو اس کی خصوصیت ہیں۔ مثلاً ضمیر، عقل و فکر، محبت، تصورات و نظریات، مذہب، فلسفہ، اخلاق، سیاست، علم اور ہنر انسان کی خودی کی سرگرمیاں ہیں اور انسان کی جسمانی یا حیوانی جبلتیں خودی کی خدمت گزار اور حاشیہ بردار ہیں۔

چونکہ انسان کی تعلیم اور تربیت سے مراد اس کی خودی کی تعلیم و تربیت ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تعلیم اور تربیت کی تمام صورتیں اس غرض و غایت کے تحت ہوں۔

حقیقتِ انسان کے متعلق یہ نقطۂ نظر اختیار کرنے سے ماہرینِ تعلیم اور دوسرے انسانی اور اجتماعی علوم کے محققین کی ساری مشکلات کا حل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس صدی کے علم الحیات اور علم الطبیعیات کے انکشافات سے اس نقطۂ نظر کی حمایت ہوتی ہے کیونکہ وہ اس نتیجہ کی طرف راہنمائی کرتے ہیں کہ کائنات کی حقیقت مادہ نہیں بلکہ شعور (consciousness) یا خودی ہے۔ ڈارون کا نظریہ جس نے مغرب کے تمام انسانی اور اجتماعی علوم کو متاثر کیا ہے، انیسویں صدی کی پیداوار تھا، جب سائنس دان مادہ کو حقیقی سمجھتے تھے۔ لیکن اس بیسویں صدی کی تحقیقات نے سائنس دانوں کو اس نظریہ کے ترک کرنے پر مجبور کیا ہے جس سے حقیقتِ انسان کے متعلق خالص اسلامی نقطۂ نظر کے لیے راستہ صاف ہو گیا ہے۔ تاہم یورپ کے انسانی اور اجتماعی علوم پر ڈارون کے نظریہ کا اثر اب تک باقی چلا آتا ہے۔ مغرب کے ان خارج از وقت علوم سے اقتباس کر کے اپنی ہدایت چاہنا وقت کے پہیے کو پیچھے کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہے۔ اب ہمیں چاہیے کہ ہم نئے انسانی اور اجتماعی علوم کی داغ بیل ڈالیں، جو حقیقتِ مادہ پر نہیں بلکہ خودی پر مبنی ہوں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ خودی کی تربیت جو تعلیم کا مقصد ہے

خودی کی تربیت کے قوانین

ہے کس طرح ہوتی ہے۔ درحقیقت جس طرح جسم کی تربیت کا سامان قدرت نے جسم کے فطرتی حیاتیاتی رجحانات کے اندر رکھ دیا ہے اور جب ہم جسم کی تربیت کرنا چاہیں تو ہم اس کے سوائے اور کچھ نہیں کر سکتے کہ ان رجحانات سے کام لیں، ان کی تائید اور اعانت کریں اور ان کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کر دیں، اور ایسا کرتے ہوئے ان کے اعمال میں کم از کم مداخلت کریں تاکہ ان کی مزاحمت کے مواقع پیدا نہ ہوں۔

اگر جسم کے فطرتی حیاتیاتی رجحانات کو مطمئن کیا جائے تو اس کا آخری نتیجہ جسمانی صحت اور طاقت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر خودی کے فطرتی نفسیاتی رجحانات کو مطمئن کیا جائے تو اس کا نتیجہ خودی کی صحت اور طاقت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ خودی کی صحت یہ ہے کہ اسے اطمینان، راحت اور خوشی حاصل ہو۔ یہی نفسیاتی یا ذہنی صحت (psychological or mental health) ہے اور خودی کی طاقت یہ ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو حیوانی یا جبلتی خواہشات کی ممکن مزاحمت کے باوجود عملی جامہ پہنا سکے۔ یہی قوتِ ارادی (will-power) ہے۔

جس طرح سے بیماری جسم کی صحت کو برباد کرتی ہے اسی طرح بدی خودی کے اطمینان کو برباد کرتی ہے۔ جسم جب طاقتور ہوتا ہے تو بیماری پر فتح پاتا ہے اور بیماری اس میں جڑ نہیں پکڑ سکتی۔ خودی جب طاقتور ہوتی ہے تو وہ بدی پر فتح پاتی ہے اور بدی اس میں جڑ نہیں پکڑ سکتی۔

جسم کا فطری حیاتیاتی رجحان یہ ہے کہ وہ کھانے کے لیے اعلیٰ درجہ کی صحت اور قوت بخشنے والی غذا چاہتا ہے۔ یعنی ایسی غذا جس میں وہ تمام حیاتین (vitamins) موجود ہوں جو جسم کی پرورش میں حصہ لیتے ہیں۔ صرف اس قسم کی غذا جسم کی ضرورت کو پورا کر سکتی ہے۔ جسم اسے ہضم کر کے اپنا جز بناتا ہے اور اس سے صحت اور قوت حاصل کرتا ہے۔ خودی کا فطری نفسیاتی رجحان یہ ہے کہ وہ محبت کرنے کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا تصورِ حسن چاہتی ہے جس کی محبت سے اسے اطمینانِ قلب حاصل ہو یعنی ایسا تصورِ حسن جس میں حسن کے وہ تمام اوصاف (attributes of beauty) موجود ہوں جن کی تمنا خودی کی فطرت کے اندر رکھی گئی ہے۔ ایسا تصورِ حسن ہی خودی کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔

خودی کی صحت اور قوت کے لیے اوصافِ حسن کی حیثیت وہی ہے جو جسم کی صحت اور طاقت کے لیے غذا کے حیاتین کی ہے۔ جس طرح ضروری حیاتین کے بغیر جسم مرجاتا ہے اسی طرح ضروری اوصافِ حسن کے بغیر خودی مایوس اور پژمردہ ہو جاتی ہے۔

خدا کا تصور خودی کی تربیت کا سرچشمہ ہے

جس طرح سے ہر غذا جسم کی صحت اور قوت کی ضامن نہیں ہو سکتی، بلکہ وہی ہو سکتی ہے جو جسم کے فطری حیاتیاتی رجحانات کو پوری طرح سے بروئے کار لائے، اور اپنے مکمل غذائی عناصر یا مکمل حیاتین کی وجہ سے جسم کی تمام حیاتیاتی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اسی طرح ہر تصورِ حسن خودی کی صحت اور طاقت کا

ضامن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہی ہو سکتا ہے جو خودی کے فطری نفسیاتی عناصر یعنی مکمل اوصافِ حسن کے سبب سے خودی کی تمام نفسیاتی ضروریات کو پورا کر سکے۔ انسانی خودی کے تقاضائے حسن کو بدرجۂ کمال پورا کرنے والا یہ مکمل تصورِ حسن اس کائناتی خودی کا تصور ہے جو اس کی تخلیق کا سرچشمہ ہے اور جسے ہم خدا کہتے ہیں۔

جس طرح جسم کی شدید حیاتیاتی ضرورت کی چیز یعنی غذا کو مہیا کرنے کے لیے قدرت نے اپنا انتظام کیا ہے یعنی زمین سے غلہ اور غذا کی دوسری چیزیں پیدا کرنے کے لیے ہوا، پانی اور روشنی کو بہم پہنچایا ہے۔ اسی طرح خودی کی شدید نفسیاتی ضرورت کی چیز یعنی مکمل تصورِ حسن کی تعلیم کے لیے قدرت نے اپنا انتظام کیا ہے جسے نبوت کہتے ہیں اور جس کی مکمل صورت خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہے جن پہ قرآن نازل ہوا ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ مکمل تصورِ حسن جو خودی کی تمام فطرتی نفسیاتی ضروریات کو بدرجۂ کمال پورا کر سکتا ہے اور جو اس کی صحت اور طاقت یعنی اس کی خوشی اور قوتِ ارادی کی تکمیل کا ضامن ہے، خودیٔ کائنات یا خدا کا تصور ہے:

فطرت اللّٰہ التی فطر الناس علیھا

دینِ اسلام انسان کی وہی فطرت ہے جس پہ خدا نے انسان کو پیدا کیا۔ کیونکہ اس میں وہ تمام اوصافِ حسن بدرجۂ کمال موجود ہیں جو خودی کی محبت کو مطمئن کر سکتے ہیں:

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی -

تمام اوصافِ حسن کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے -

کسی غذا کی صحت اور طاقت بخشنے والی خاصیات کو ثابت کرنے کے لیے کیمیاوی تجزیہ بھی کام دے سکتا ہے لیکن ان کا کوئی ثبوت اس سے بہتر نہیں کہ غذا کو استعمال کر کے تجربہ کر لیا جائے - اسی طرح اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ خدا کے تصوّر میں وہ تمام اوصاف بدرجۂ کمال موجود ہیں جن کی محبت سے خودی صحت اور طاقت حاصل کرتی ہے - ہم عقلی تجزیہ اور استدلال سے بھی کام لے سکتے ہیں - لیکن اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کوئی نہیں کہ خودی کو اس تصوّر کی محبت کا خوگر بنا کر دیکھ لیا جائے - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خودی کو ایسا زورِ عمل اور اطمینانِ قلب حاصل ہوگا جو اور کسی تصوّر سے ممکن نہیں

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ -

یاد رکھو کہ اللہ کی محبت سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے

صحیح نصب العینِ حیات اور صحیح مقصدِ تعلیم

خدا کا تصوّر وہ مکمل تصوّرِ حُسن ہے جو انسان کی زندگی کا صحیح نصب العین اور تعلیم کا بھی صحیح نصب العین ہے ، اسی تصوّر کی محبت ہے جس سے انسان کی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے جو انسان کو ایک مکمل زندگی کے لیے تیار کرتی ہے جو ایک تندرست جسم کے اندر ایک تندرست جان پیدا کرتی ہے جو انسان کی بہترین مخفی صلاحیتوں کو پیدا کرتی ہے اور جو انسانی انفرادیت کی اس آزادانہ نشوونما کو ممکن بناتی ہے

جو سرپرسی نن کے نزدیک تعلیم کا مدعا ہونا چاہیے - اپنی زندگی میں کامیاب ترین انسان اور نیز اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ انسان وہ ہے جس نے اس تصوّر کی محبت کو درجۂ کمال تک پہنچایا ہو اور جو اس محبت کو اپنی عملی زندگی میں ٹھیک طرح اور پوری طرح سے ظاہر کر رہا ہو - ماہرِ تعلیم کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ اس تصوّر کی محبت اور اس کے اوصاف کی محبت نہ صرف طالب علم کے دل میں پوری طرح نشوونما پائے بلکہ اس کی عملی زندگی کے ہر پہلو میں بھی پوری طرح نمودار ہو -

فطرتِ انسانی کے اہم قوانین

حُسن خودی کی غذا ہے اور حسن کی محبت خودی کی بھوک ہے ، خودی جس کی تسکین پر اس کی تربیت اور نشوونما کا دارومدار ہے اپنی فطرت کے بعض قوانین کے تحت اسے مطمئن کرتی ہے - ضروری ہے کہ ماہرِ تعلیم جو خودی کی تربیت کا ذمّہ دار ہے ان قوانین سے واقف ہو - لہٰذا ان کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے :

۱ - اگر کسی شخص کو اچھی غذا نہ مل سکے ، تب بھی وہ اپنی بھوک کو روک نہیں سکتا ، بلکہ مجبور ہوتا ہے کہ اسے جو غذا بھی مل جائے اسی سے اپنی بھوک کی تسکین کا سامان پیدا کرے اور اسی میں لذت محسوس کرے - اسی طرح جب خودی اپنی لاعلمی کی وجہ سے مکمل تصوّرِ حُسن کو جو اس کے لیے صحیح اور مکمل غذا کا حکم رکھتا ہے نہیں پا سکتی یعنی اس کے محاسن اور کمالات کا ذاتی احساس کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے تو وہ مجبوراً ایک غلط اور غیر مکمل تصوّر کو اپنی محبت کے لیے اختیار کر لیتی ہے - اس تصوّر میں اسے چند اوصاف

حُسن کی جھلک تو صاف طور پر نظر آتی ہے لیکن باقی ماندہ صفاتِ حسن کو وہ اس کی طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر لیکن ہر حالت میں غلط طور پر منسوب کر کے ان کی موجودگی کا احساس کرنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی غلط تصوّر سے بھی اس وقت تک محبت نہیں کر سکتی، جب تک کہ وہ اس کی طرف ان تمام صفاتِ حسن کو منسوب نہ کرے جو صرف مکمل تصوّرِ حُسن میں موجود ہیں اور جن کی تمنا اس کی فطرت کے اندر ودیعت کی گئی ہے۔ ایسا کرنے کے بعد وہ اپنے غلط اور غیر مکمل تصوّرِ حُسن سے بھی اس طرح محبت کرتی ہے۔ گویا وہ سچ مچ کا صحیح اور مکمل تصوّرِ حُسن ہے۔

۲۔ تصوّرِ حُسن کی محبت کا تقاضا تصوّرِ حُسن کی ستائش اور پرستش ہے۔ تصوّر کی ستائش اور پرستش سے خودی مطمئن ہوتی ہے، اور تربیت پاتی ہے۔

۳۔ تصوّرِ حُسن خواہ صحیح ہو یا غلط: خودی کی ساری زندگی کا نصب العین اور مدار اور محور بن جاتا ہے۔ خودی کے سارے جذبات و احساسات اور اعمال و افعال اس نصب العین کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اس کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کرتی ہے۔ اسی کے لیے زندہ رہتی اور مرتی ہے۔ خودی کو معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے کون سے اعمال کو اختیار کرنے اور کون سے اعمال کو ترک کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ اپنے نصب العین سے ایک قانونِ اخلاق یا ضابطۂ عمل اخذ کرتی ہے اگر نصب العین صحیح ہو تو یہ قانونِ اخلاق یا ضابطۂ اوامر و نواہی بھی صحیح ہوتا ہے،

ورنہ غلط ہوتا ہے۔

(۴) ایک تصوّرِ حُسن یا نصب العینِ حیات کو ماننے والے افراد اپنے نصب العین کی محبت سے مجبور ہوتے ہیں کہ وہ مل کر ایک جماعت بنائیں، اور اس جماعت میں رہیں۔ نصب العین کی محبت اس جماعت کے افراد میں وحدت اور تنظیم پیدا کرتی ہے اور لہٰذا جماعت ایک ریاست کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ریاست کی تمام سیاسی، فوجی، اقتصادی، قانونی تعلیمی، سماجی اور علمی سرگرمیاں اس نصب العین کے تحت پیدا ہوتی ہیں، اور قدرتی طور پر (جیسا کہ فرد کی صورت میں درست ہے) اگر ریاست یا جماعت کا نصب العین صحیح ہو تو اس کی یہ سرگرمیاں بھی صحیح ہوتی ہیں، ورنہ غلط ہوتی ہیں۔ ریاست کے افراد اپنے نصب العین کے نفسیاتی اثرات آئندہ نسلوں کو وراثتاً سپرد کرتے ہیں اور اس طرح نصب العین صدیوں تک زندہ رہتا ہے۔ اشتراکیت، جمہوریت، انگریزی قومیت، ہندی قومیت، امریکی قومیت ایسے نصب العین ہیں جو سب غلط ہیں۔

۵۔ جب ایک نصب العین غلط ہو تو چونکہ اس میں تمام اوصافِ حُسن فی الواقع موجود نہیں ہوتے۔ بلکہ چند اوصاف حسن کے نمائشی وجود کی بنا پر فرض کر لیے جاتے ہیں۔ اس لیے کچھ مدت کے بعد خودی کو اسکے نقائص کا علم ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی محبت کمزور ہو جاتی ہے اور بالآخر مٹ جاتی ہے۔ جب یہ صورت پیش آتی ہے تو خودی اپنے تقاضائے حُسن کو مطمئن کرنے کے لیے ایک اور تصور اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح

سے ہر غلط تصور آخرکار ناتسلی بخش اور ناپائیدار ثابت ہوتا ہے ۔

خودی کی محبت صفات کے نتائج اور ان کی تعلیمی اہمیت

۶۔ خودی کی فطری محبت نہ صرف خدا سے ہے بلکہ خدا کی صفاتِ حُسن سے بھی ہے ۔ یعنی ان صفات کے لیے اس کی فطرت میں ایک علیحدہ کشش ہے جو ہر شخص میں موجود ہوتی ہے خواہ اس کا تصورِ حسن صحیح ہو یا غلط اور وہ مومن ہو یا کافر لیکن یہ کشش صفاتِ حق نصب العین کی محبت کے تحت ظہور پاتی ہے ۔ اس سے الگ یا اس کی مخالفت میں ظہور نہیں پا سکتی ۔

محبتِ صفات کا ایک نتیجہ عالمگیر اصولِ اخلاق کی محبت میں ظاہر ہوتا ہے ۔ جب کوئی شخص صفاتِ حسن کے مطابق عمل کرتا ہے تو اس کا عمل سچائی، انصاف، نیکی وغیرہ عالمگیر اصولِ اخلاق کے مطابق سمجھا جاتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے دل میں خواہ وہ کافر ہو یا مومن، عالمگیر اصولِ اخلاق کی پابندی کا فطری جذبہ موجود ہے لیکن چونکہ کافر کا نصب العین حیات غلط ہوتا ہے اور وہ نصب العین اس کے لیے اوامر و نواہی کا ایک الگ ضابطہ مقرر کر چکا ہوتا ہے لہٰذا کافر کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ عالمگیر اصولِ اخلاق یا صحیح تصورِ حسن کے ضابطۂ اوامر و نواہی کی پابندی کر سکے ۔ ان اصولوں کے لیے اس کی فطری کشش اس کے غلط نصب العین اور اس کے مقرر کیے ہوئے قانونِ عمل کی محبت سے مغلوب ہو کر رہ جاتی ہے ۔ اس کے برعکس مومن کے لیے جس حد تک کہ وہ

فی الواقع صحیح تصورِ حسن کی محبت رکھتا ہو ۔ ان عالمگیر اصولِ اخلاق کے مطابق عمل کرنا آسان ہوتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا نصب العین یا تصورِ حسن صحیح ہوتا ہے اور اس کی محبت ان اصولوں کی فطری کشش کے ساتھ مزاحمت نہیں کرتی ۔ بلکہ ان کی اور تائید کرتی ہے کیونکہ یہ اصول اسی صحیح نصب العین کے ضابطۂ اوامر و نواہی پر مشتمل ہوتے ہیں ۔

محبتِ صفات کا دوسرا نتیجہ علم کی جستجو میں ظاہر ہوتا ہے کیونکہ علم کی تلاش یہ سچائی، صداقت یا حق کی جستجو ہے ۔ حق خدا کی ایک صفت ہے اور علوم خدا کی اس صفت کے جزوی انکشاف کا درجہ رکھتے ہیں ۔ یہ انکشاف ایک قوت ہے جس کی مدد سے انسان اپنے نصب العین کی خدمت اور اعانت بہتر طریق سے کر سکتا ہے ۔

اس کا تیسرا نتیجہ ہنر (art) کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔ جب ہم کسی ظاہری واسطہ کے ذریعے سے حُسن کا اظہار کرتے ہیں تو اسے ہنر (art) کہا جاتا ہے ۔ مثلاً جب ہم لفظ میں حُسن کا اظہار کرتے ہیں تو اسے شعر کہا جاتا ہے ۔ جب سنگ و خشت میں حُسن کا اظہار کرتے ہیں تو اسے بُت سازی اور تعمیر کا نام دیا جاتا ہے ۔ وعلیٰ ہذا القیاس ۔

ہنر کی اہمیت

خودی تو کائنات اپنی تخلیق میں حُسن کا اظہار کرتی ہے کیونکہ اس کی تخلیق کا سرچشمہ ہی حُسن کی محبت ہے ۔ لہٰذا اس کی تخلیق ہنر کی صورت اختیار کرتی ہے وہ مصور ہے، نقاش ہے اور اس کی ہر تخلیق میں ترتیب، نظم اور بناؤ کے اوصاف موجود ہوتے ہیں ۔

انسانی خودی میں بھی اپنی ہر تخلیق میں حُسن کا اظہار کرنے کی خواہش موجود ہے اور اس اظہارِ حُسن سے اس کی محبت نشو و نما پاتی ہے۔ گویا ہنر خودی کی تربیت کا ایک ذریعہ ہے لیکن یہ اسی صورت میں کارآمد ہے جب اسے صحیح نصب العین کی محبت اور خدمت کے تحت کام میں لایا جائے۔ ہنر کی کئی قسمیں ایسی ہیں جو آسانی سے بداخلاقی کا ذریعہ بن جاتی ہیں مثلاً موسیقی اور ناچ ان سے طالب علم کو فائدہ کی بجائے نقصان کا اندیشہ ہے لیکن ہنر کی ایک قسم ایسی ہے جو تعلیمی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے اور جس کی طرف معلم کو لازماً توجہ دینی چاہیے اور وہ ہے طرزِ زندگی میں حُسن کا اظہار۔ جو شخص اپنے گھر کی تزئین و آرائش میں کمروں کے اندر چیزوں کی ترتیب میں اپنی وضع قطع میں اپنے لباس میں اپنی نشست و برخاست اور بات چیت میں لوگوں کے ساتھ اپنے میل جول اور برتاؤ کے طریقوں میں اور چلتے پھرتے، سفر کرتے، کھیلتے، لکھتے پڑھتے اپنی جملہ حرکات و سکنات میں حسن کا اظہار کرنا جانتا ہے وہ یقیناً دوسرے لوگوں سے زیادہ تربیت یافتہ ہے۔

صحیح نظامِ تعلیم

فطرتِ انسانی کے ان حقائق سے ماہرِ تعلیم نہایت ہی اہم نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ مثلاً اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے ضروری ہے کہ طالب علم کے سامنے خودیٔ کائنات کے تصور کو زندگی اور تعلیم کے ایک مثبت نصب العین کے طور پر رکھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو طالب علم کے دل و دماغ پر غلط اور ناقص نصب العین مسلط ہو جائے گا اور پھر نتیجہ یہ ہو گا کہ طالب علم کی ساری زندگی غلط راستے پر چل نکلے گی۔ جیسے کہ وہ ٹرین

جس کا کانٹا غلط طور پر بدل دیا گیا ہو۔ وہ فرض، نیکی، سچائی، آزادی، انصاف اور اس جیسی دوسری اقدار کا مفہوم غلط سمجھے گا اور وہ مفہوم وہی ہو گا جو اس کا غلط نصب العین تلقین کرے گا۔ پھر ان حقائق سے ماہرِ تعلیم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس تصور کی بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلیم کے بغیر وہ اس بات کی توقع نہیں کر سکتا کہ طالب علم میں عالمگیر اصولِ اخلاق کے مطابق عمل کرنے کا ملکہ پیدا ہو گا۔

ہم میں سے بعض کا خیال ہے کہ اسلامی نظریۂ زندگی کے مطابق تعلیم دینے کے معنی یہ ہیں کہ اخوت، مساوات اور رواداری ایسی اسلامی اقدار کو نظامِ تعلیم میں داخل کر دیا جائے۔ بے شک اگر اخوت، مساوات اور رواداری کی اقدار کو اسلامی نقطۂ نظر سے سمجھا جائے تو وہ اسلامی اقدار ہیں لیکن جب تک نظامِ تعلیم کے اندر خدا کے تصور کو علی الاعلان داخل نہ کیا جائے اور طالب علم کے دل میں اس تصور کی محبت کو درجۂ کمال پر نہ پہنچایا جائے اس وقت تک ناممکن ہے کہ طالب علم ان اقدار پر عمل کرنا تو ایک طرف ان کی روح سے بھی آشنا ہو سکے۔

پھر ایک ماہرِ تعلیم کو ان حقائق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ طالب علم کی تربیت اس وقت تک ناقص رہے گی جب تک کہ وہ اسے خودی کے تقاضائے حسن کو ہر اس طریق سے مطمئن کرنے کے مواقع بہم نہ پہنچائے گا جو خودی کے فطرتی نفسیاتی رجحانات کے اندر مقرر ہو چکا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کے لیے ضروری ہو گا کہ تصورِ حُسن کی ستائش اور پرستش کے مواقع بہم

پہنچائے۔ تصورِ حُسن کی ضروریات کے تحت اس کی بہتر خدمت اور اعانت کے لیے طالب علم کو ضروری حد تک ضروری علوم سے آشنا کرائے۔ طالب علم کے اخلاق کی تربیت اس طرح کرے کہ اس میں صفاتِ باری تعالیٰ کا عکس نمودار ہو اور اسے طرزِ بود و باش میں حُسن و جمال کے اظہار کی راہنمائی کرے اور پھر ان حقائق سے ماہرِ تعلیم کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مغرب کے جملہ نظام ہائے تعلیم جن میں سے ایک ہمارے ملک میں رائج ہے سب کے سب غلط ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو صحیح نصب العین پر مبنی ہو۔ زندگی کے غلط نصب العین جہاں جہاں موجود ہیں غلط تعلیم کا نتیجہ ہیں اور غلط تعلیم جہاں جہاں موجود ہے غلط نصب العین کی محبت پیدا کر رہی ہے۔ ہر نصب العین سے ایک مخصوص نظامِ تعلیم نکلتا ہے اور ہر نظامِ تعلیم ایک مخصوص نصب العین کی محبت پیدا کرتا ہے۔

فطرتِ انسانی کے ان حقائق کی بنا پر ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم موجودہ نظامِ تعلیم کو موقوف کر کے اس کی جگہ فی الفور ایک نیا نظام نافذ کریں جو زندگی و تعلیم کے صحیح نصب العین یعنی خودی کے نصب العین پر مبنی ہو۔ تعلیم کے معاملہ میں ایسے لوگوں کا تتبع کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی وجہ جواز نہیں جنھوں نے گو فنِ تعلیم اور فلسفۂ تعلیم کے متعلق بہت سا لٹریچر پیدا کیا ہے۔ لیکن جو اس کے باوجود تعلیم کے صحیح مقصد و مدعا سے بے خبر ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی شخص ایک خاص سفر کے لیے مہینوں سے تیاریاں کر رہا ہو۔ لیکن یہ نہ جانتا ہو کہ اسے جانا کہاں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی ٹرین میں

بیٹھ جائے جو اس کی منزلِ مقصود سے بالکل برعکس سمت میں جاتی ہو۔ جب تک تعلیم کا صحیح مقصد معلوم نہ ہو اس وقت تک اگر تعلیم کے موضوع پر ہزاروں کتابیں بھی لکھی جائیں تو بے کار ہیں۔

مغرب میں مذہب اور تعلیم کے افتراق کی وجہ

مغرب کے لوگوں نے اگر تعلیم کو مذہب سے الگ کر دیا ہے تو ان کے پاس اس کے سوائے اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا مذہب جب مغرب کی کسی قوم کے نصب العین کا جز نہیں تو کس طرح یہ ممکن تھا کہ وہ ان کے نظامِ تعلیم کا جزو ہوتا؟ مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کے بعد مغربی قوموں کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے زندگی کے کسی شعبہ میں اپنے ساتھ رکھتے۔ ان کے ہاں مذہب اور تعلیم کا افتراق مذہب اور سیاست کے افتراق کا لازمی نتیجہ ہے۔ مذہبِ عیسائیت ان منظم جماعتوں کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر تھا، جنھیں ریاستیں کہا جاتا ہے۔ انھوں نے مذہب کو سیاست سے اس وقت مجبوراً الگ کیا جب کلیسا اور ریاست کے طویل جھگڑوں نے یہ بات پوری طرح سے ثابت کر دی تھی کہ دونوں کا یکجا رکھنا بے سُود بلکہ ناممکن ہے۔ بعض وقت یورپ میں کلیسا اور ریاست کے انفصال کو ہم مکیاولی (Machiavelli) کے فلسفہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جس نے حکمرانوں کو اختیار دے دیا تھا کہ اگر ریاست کے اندرونی اور بیرونی انتظام کے لیے ضروری ہو تو وہ ہر قسم کی مذہبی اور اخلاقی قیود کو توڑ کر جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن در اصل یورپ میں مکیاولی کے فلسفہ کا ظہور ایک ایسے

وقت ہیں ہوا، جب یورپ کی قومیں اسے قبول کرنے کے لیے پہلے ہی پوری طرح سے آمادہ ہو چکی تھیں۔

لیکن زندگی کا وہ تصور جو ہمیں اسلام نے دیا ہے عیسائیت کے تصور سے بہت مختلف ہے۔ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے سیاست نہ صرف اس سے مطابقت رکھتی ہے بلکہ وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتی پھر ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہم تعلیم کے بارے میں وہی نقطۂ نظر اختیار کریں جو مغربی قوموں کو عیسائیت کے نقائص کی وجہ سے اختیار کرنا پڑتا ہے مغرب کے ماہرینِ تعلیم کے لیے مذہب اور تعلیم کو بہم رکھنا ایسا ہی مضحک ہے جیسا کہ ہمارے لیے مذہب اور تعلیم کو جدا رکھنا۔

> ہر قوم کا سیاسی نظریہ اس کا معبود بنتا ہے

اگر ہم رائج الوقت نظریاتِ زندگی مثلاً اشتراکیت، جمہوریت، قومیت وغیرہ کا بغور مطالعہ کریں تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ ایک قوم کا نصب العینِ حیات اس کی زندگی کے تمام شعبوں پر حکومت کرتا ہے اس کا نظامِ قانون، نظامِ سیاست، نظامِ تعلیم، نظامِ معاشیات، غرضیکہ اس کی زندگی کے تمام اعمال اسی کے تحت تشکیل پاتے ہیں وہ اس کی خدمت کے لیے وجود میں آتے ہیں اور ہر آن ان کی خدمت کے لیے وقف رہتے ہیں۔ غرض ایک قوم کا نصب العینِ حیات ایک ایسے معبود کا مقام حاصل کرتا ہے جو فی الواقع اس کی محبت پرستش اور اطاعت کا مرکز ہوتا ہے۔ یورپ کی نام نہاد عیسائی قومیں اس وقت عملی طور پر جس خدا کی عبادت کر رہی ہیں

وہ عیسائیت کا خدا نہیں، اگرچہ یورپ کے لوگ اپنی زبان سے کبھی کبھی اس خدا کا نام بھی لیتے ہیں لیکن دراصل اب ان کا یقین اس سے اٹھ گیا ہے اور وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان کی عملی زندگی کے کسی حصہ پر اس کا تسلط باقی ہے۔ لہٰذا انھوں نے اسے زندگی کے ہر شعبہ سے خارج کر دیا ہے اور اب ان کی زندگی کے کسی پہلو کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اب عیسائیت کے خدا کی بجائے یورپ کی اقوام نے اور معبودوں کو اختیار کر لیا ہے اور وہ ان کے سیاسی نظریات ہیں۔ اس وقت یورپ کی ہر قوم کا سیاسی نظریہ یا معبود الگ ہے۔ اب بائبل کے خدا کی حقیقت ان کے نزدیک اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ان کے اصلی معبود یعنی سیاسی نظریہ کے خادم کی حیثیت سے رہے تاکہ جب ضرورت پڑے اور جس حد تک ممکن ہو وہ اس کا نام لے کر اپنے اصلی معبود کے راستے کی مشکلات کو آسان کریں۔

> نظریۂ تعلیم نظریۂ زندگی کے تحت وجود میں آتا ہے

ہر قوم اپنا فلسفۂ تعلیم یا نظریۂ تعلیم اس طرح بناتی ہے کہ وہ ان کے نظریۂ زندگی کی مناسب خدمت کر سکے اور ان کی عملی زندگی کے معبود کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ یورپ کے نظریاتِ تعلیم جو مختلف یورپی قومیتوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آتے ہیں، ہمارے نظریۂ زندگی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے جس طرح ان کے نظریاتِ زندگی غلط ہیں اسی طرح ان کے نظریاتِ تعلیم بھی غلط ہیں۔ خودی کا نظریۂ حیات بلند تر اور صحیح تر نظریۂ حیات، ان کے ذہن میں نہیں آ سکتا۔ چونکہ حق تعالیٰ کی

ذات تمام کمالاتِ معنوی کا مجموعہ ہے اور اس کے حسن و کمال کی انتہا نہیں۔ لہٰذا جو نظریۂ تعلیم خودی کے تصور پر قائم کیا جائے گا، وہ صحیح ترین ہوگا۔

پھر تمام غلط نظریاتِ زندگی نا تسلی بخش ہونے کی وجہ سے ناپائدار ہیں اور تاریخِ انسانی کے جلد گزر جانے والے مراحل ہیں۔ ضروری ہے کہ ہر نظریۂ زندگی ایک نہ ایک دن کسی فوری سیاسی انقلاب کی وجہ سے یا ایک تدریجی انحطاط کی وجہ سے ختم ہو جائے۔ انسان ایسے تصورات زندگی سے جو اس کی خودی کی ضروریات کو پورا نہ کر سکتے ہوں مکمل اور مستقل طور پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ نفسیاتِ انسانی کے ٹھوس حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ ارتقائے کائنات کی قوتیں جن کے عمل سے کائنات رفتہ رفتہ کامل سے کامل تر ہوتی جا رہی ہے، بالآخر ہر غلط نظریۂ زندگی کو مٹا دیں گی اور صرف خودی کا نظریۂ حیات روئے زمین پر باقی رہ جائے گا۔ قرآن میں یہ پیش گوئی موجود ہے اور علمی حقائق اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری قوم اپنے صحیح اور کامل نظریۂ زندگی کی وجہ سے ارتقا کی انتہا پر ہے اور دوسری قومیں ارتقا کے راستے پر قدم بقدم ہمارے پیچھے چلی آتی ہیں اور آخر کار ہماری قیادت قبول کرنے پر مجبور ہوں گی۔

کس قدر افسوس ہے کہ ہم اقوامِ عالم کی راہ نمائی کے اس معزز مقام کو جس پر قدرت نے ہمیں فائز کیا ہے دوسروں کے سپرد کر دیں اور تعلیم اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں غیروں کی دست گیری کے بجائے یہ

آس لگائے بیٹھے رہیں کہ وہ ہماری دست گیری کریں گے۔ جو لوگ انسانی زندگی کے مقصد سے ناآشنا ہیں وہ تعلیم کے بارے میں ہماری راہنمائی کیونکر کر سکتے ہیں؟

صحیح نظریۂ تعلیم کی اہمیت امن اور ترقی کا ذریعہ

صحیح نظریۂ زندگی ایک ہے لیکن غلط نظریاتِ زندگی لاتعداد ہیں اور چونکہ وہ لاتعداد ہیں اس لیے وہ نوعِ انسانی کو ایسے ٹکڑوں میں بانٹ دیتے ہیں جن میں اخلاقی نقطۂ نظر سے اشتراکِ عمل ممکن نہیں ہوتا۔ چونکہ ہر گروہ یا قوم کا ضابطۂ اخلاق اس کے نظریۂ زندگی سے پیدا ہوتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ وہ ہر دوسری قوم کے ضابطۂ اخلاق سے الگ ہو۔ اس طرح غلط نظریات کی پرستش نوعِ بشر کے لیے بے اتفاقی، جنگ، خونریزی اور بالآخر مکمل تباہی اور بربادی کا موجب ہوتی ہے۔ اس خطرناک صورتِ حال کا علاج فقط ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ نوعِ بشر ایک نصب العینِ حیات پر متفق ہو جائے۔ یہ نصب العین وہی ہو سکتا ہے جو صحیح اور کامل ہو یعنی اس قابل ہو کہ خودی کے تقاضوں کو بہ تمام و کمال پورا کر سکے۔ قومیں کسی غلط نصب العین پر متفق نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر وہ متفق ہو جائیں تو ان کا اتفاق تادیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غلط نصب العین انسان کی فطرت کو مکمل طور پر مطمئن نہیں کر سکتا۔ ایک صحیح نصب العینِ حیات ہی انسان کے لیے دائمی امن اور اطمینان و ترقی اور فارغ البالی کا ضامن ہے اگر ہم اپنا نظامِ تعلیم اس نصب العین کے مطابق بنائیں گے تو ہم ایک ایسی

قوم تیار کریں گے جو اقوامِ عالم کو امن اور ترقی کا راستہ دکھا سکے گی۔

تعلیم بذاتِ خود نہ اچھی چیز ہے نہ بری۔ بلکہ صرف نظریاتِ زندگی کی خادم ہے اور تمام نظریات کی خدمت و اعانت یکساں طور پر کرتی ہے۔ جب وہ صحیح نظریۂ زندگی کی اعانت کرتی ہے تو اچھے نتائج پیدا کرتی ہے اور اچھی سمجھی جاتی ہے اور جب وہ کسی غلط نظریۂ زندگی کی اعانت کرتی ہے تو برے نتائج پیدا کرتی ہے اور قبیح سمجھی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ بے کار ہی نہیں بلکہ مضر اور خطرناک ہوتی ہے۔

تعلیم قلب ذہنیت کا ایک زبردست انجن ہے

تعلیم اپنے اچھے یا برے نظریۂ زندگی کی اعانت اس طرح کرتی ہے کہ وہ انسان کو اس کا معتقد بنا دیتی ہے، اور اعتقاد کو اس قدر پختہ کر دیتی ہے کہ وہ ایک مجنونانہ محبت یا عشق تک پہنچ جاتا ہے اور انسان کی ساری شخصیت کو جذب کر لیتا ہے۔ پھر اس نظریۂ زندگی کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں اور جانفشانیاں کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان اشخاص کے لیے جو کسی ملک کے تعلیمی ذرائع پر پورا تصرف رکھتے ہوں، نہایت آسان ہے کہ وہ نیکوکاروں کے ایک گروہ کو اس طرح سے بدل دیں کہ وہ دنیا کے بدترین جرائم کا ارتکاب کرنے میں کوئی شرم یا ندامت محسوس نہ کریں یا بدکاروں کی ایک جماعت کو نیکی کی محبت سے اس طرح سرشار کر دیں کہ ان کے لیے بدی یا گناہ کا ارتکاب ناممکن ہو جائے سب کو معلوم ہے کہ جرمنی، اٹلی اور روس کے انقلابات کے ابتدائی مراحل میں ان ملکوں کے لوگ جدید انقلابی تصورات

سے کس قدر متنفر تھے، لیکن رفتہ رفتہ تعلیم کے جادو نے ان کی ذہنیتوں کو یہاں تک بدل دیا کہ گزشتہ جنگِ عظیم سے پہلے وہ ان تصورات کی خاطر شاندار قربانیاں کرنے کے لیے دل و جان سے تیار ہو گئے۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ غلط نظریاتِ زندگی کے پرستار تو تعلیم کی زبردست کل کو اس لیے اپنے کام میں لائیں کہ شر و فساد اور جنگ و جدال کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ فروغ حاصل ہوتا رہے اور ہم صحیح نظریۂ حیات کے ماننے والے ان کے شر انگیز نظام ہائے تعلیم کو ایک مخفی طفلانہ حسد اور ستائش کے جذبہ سے دیکھتے رہیں اور خود دنیا کو شر و فساد اور جنگ و جدال سے بچانے کے لیے اس زبردست کل کو حرکت میں نہ لائیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اور لوگ تعلیم کے طاقتور انجن کی مدد سے دنیا کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسی انجن کو ان کے خلاف موڑ دیں تاکہ دنیا تباہی سے بچ جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کو اس طرح بدلیں کہ اس کی وجہ سے ہمارے دلوں میں صحیح نظریۂ زندگی کی معقولیت اور عظمت اور اس کی والہانہ محبت کا جذبہ پیدا ہو۔ جب تک ہم خود اپنے نظامِ تصورات کی معقولیت اور عظمت کے قائل نہ ہوں گے ناممکن ہے کہ اس کی طرف دوسروں کو کامیابی سے دعوت دے سکیں۔

تبلیغ کا طریق اور تعلیم

اسلامی تصوراتِ خودی کی فطرت کے حقائق ہیں جو خودی کے لیے کشش رکھتے ہیں اور خودی کی جستجوئے صداقت کا مدعا ہیں لہٰذا اگر ہم ان کو دنیا کے سامنے ٹھیک طرح پیش کرنے کا

ڈھب سیکھ جائیں تو یقینی بات ہے کہ نوعِ انسانی انھیں فوراً قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔ دنیا کو اسلام کی طرف سے دعوت دینے اور اسلامی تصورات کی طرف دعوت دینے میں بڑا فرق ہے اور اس زمانہ میں ہمارے لیے اس فرق کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر ہم دنیا کو اس زمانے میں اس کے امن اور اتحاد کی خاطر اسلام کی دعوت دینا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس غرض کے لیے پہلے زمین کو ہموار کریں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے دنیا کو اسلام کا نام لیے بغیر اسلامی تصورات کی طرف اس طرح دعوت دیں کہ لوگ ان کی صحت اور معقولیت کا اعتراف کرنے لگ جائیں۔ غیروں کے سامنے اسلام کی تبلیغ کرتے ہوئے ہمیں اسلام کا نام اس وقت لینا چاہیے، جب ہم یہ سمجھنے لگیں کہ اب ہماری تبلیغ سے ان کے اندر اسلامی تصورات کی محبت اس حد تک پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ان تصورات کے آسمانی ماخذ یعنی قرآن کو ماننے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ اب تک اسلام کی تبلیغ کا جو طریقہ ہم نے اختیار کر رکھا تھا، وہ یہ تھا کہ اسلام کو ایک کل (TOTALITY) کے طور پر پیش کیا جائے۔ یہ طریقہ اس زمانے میں نہایت کامیاب تھا، جب اسلام کی بڑی بڑی روحانی شخصیتیں، مثلاً حضورؐ کے صحابہؓ یا اولیا اور صوفیائے کرام اسے کام میں لانے کے لیے موجود تھے، اور جب لوگ نسبتاً سادہ لوح اور حق پسند تھے۔ اب لوگ مذہب سے بیزار ہیں اور اسے ہوش و خرد کا دشمن سمجھتے ہیں۔ اس زمانے کے عقلیت زدہ لوگوں کو اسلامی افکار و آرا سے متاثر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم انھیں تدریجاً معروف سے غیر معروف کی طرف لائیں ان ہی کے مسلمات سے آغاز کر کے جدید قسم کی علمی تحقیق اور نئے ڈھب کے عقلی

استدلال کی مدد سے پہلے اسلامی تصورات کی طرف اور پھر ایک کل کے طور پر اسلام کی طرف دعوت دیں۔ اپنی قوم کو اسلام کی ایسی علمی اور عقلی تبلیغ کا اہل بنانے کے لیے ہمیں ایک اسلامی نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے۔

> تعلیمی مسئلہ زندگی اور موت کی اہمیت رکھتا ہے

اسلامی تصورات کی تبلیغ جو اسلامی تعلیم اور تربیت پر موقوف ہے ہمارے لیے فقط اس بنا پر ضروری نہیں کہ وہ دوسری قوموں کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنے گی یا اس سے دنیا میں امن و اتحاد قائم ہوگا، یا وہ ہمارے لیے سعادتِ اُخروی کا موجب ہوگی۔ گو اس میں شک نہیں کہ قوموں کی فلاح و بہبود اور دنیا کے امن و اتحاد کا دار و مدار ہماری تبلیغ پر ہے، اور یہ تبلیغ ہمارے لیے سعادتِ اُخروی کا موجب بھی ہوگی۔ لیکن اسلام اور اسلامی تصورات کی تبلیغ کا مسئلہ خود ہمارے لیے اس دنیا میں بھی زندگی اور موت کی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر بلکہ اس میں ڈھیل اور سستی کرنے سے بھی ہم ایک قوم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم دوسری قوموں کو مغلوب نہیں کریں گے تو یقینی بات ہے کہ ہم خود ذہنی طور پر ان سے مغلوب ہو جائیں گے اور ذہنی غلامی ہمیشہ سیاسی غلامی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

اس زمانے میں قومیں اپنے نظریاتِ زندگی کی بنا پر متحد ہو رہی ہیں ہر قوم چاہتی ہے کہ اپنے نظریۂ زندگی کو ماننے والے افراد یا اقوام کی تعداد میں

اضافہ کر کے اپنے آپ کو اور طاقتور بنائے۔ اس غرض کے لیے وہ پراپیگنڈا کے تمام جائز اور ناجائز ذرائع کو کام میں لاتی ہے جس حد تک کوئی قوم کسی دوسری قوم کے نصب العین کے اثرات کو قبول کرتی ہے اس حد تک وہ خود کمزور ہو جاتی ہے اور اس کی حریف قوم طاقتور ہو جاتی ہے۔ اگرچہ وہ قوم اپنی کمزوری یا حریف قوم کی طاقت کا فوری احساس نہ کرے۔ ہر قوم ہر دوسری قوم کی دشمن ہے اور اس کی قوت کو سلب کر کے اپنی قوت میں اضافہ کرنا چاہتی ہے لہٰذا اس کے ساتھ ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں مصروف رہتی ہے۔ قومیں توپ و تفنگ کے ساتھ تو شاذ و نادر ہی ایک دوسرے کے مقابلہ پر آتی ہیں لیکن تصورات کے آلات کے ساتھ وہ ہر آن اور ہر لمحہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی رہتی ہیں اور تصورات کے حملے توپ و تفنگ کے حملوں سے کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔

ذہنی محاذ اور فوجی محاذ کا مقابلہ

جب ایک قوم ذہنی محاذ پر شکست کھا جاتی ہے تو خواہ اس کی فوجی طاقت کیسی ہی زبردست ہو وہ فوجی محاذ پر لڑنے کے قابل نہیں رہتی، بلکہ خود بخود ہتھیار ڈال کر دشمن کے ساتھ مل جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی قوم ذہنی محاذ پر اپنے آپ کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ تھوڑی سی فوج کے ساتھ دشمن کی فوج کو شکست دے دیتی ہے۔ اور اگر دشمن اسے فوجی لحاظ سے مغلوب بھی کر لے تو اس کا غلبہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس حقیقت سے پتہ چلتا ہے کہ ذہنی محاذ فوجی محاذ کے مقابلے میں کس قدر زیادہ اہم ہے۔ کہا

جاتا ہے کہ دشمن پر حملہ کرنے میں پہل کرنا دشمن کے حملہ سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ ہے۔ یہ اصول جس قدر فوجی محاذ کی صورت میں درست ہے۔ اسی قدر ہی ذہنی محاذ کی صورت میں بھی درست ہے۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے [illegible] ے خلاف اپنے تصورات کے حملہ کو شروع کر چکے ہیں۔ اگر ہم اس حملہ کا مؤثر جواب نہ دیں تو ہماری زندگی خطرہ میں رہے گی۔ اپنی قوم کو دوسری قوموں کے غلط تصورات کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم فوراً دوسری قوموں کے خلاف علمی اور عقلی تصورات کے پُرامن آلات کے ساتھ جارحانہ کارروائی کا آغاز کریں، اور جب تک ہمیں مکمل غلبہ حاصل نہ ہو جائے اسے متواتر جاری رکھیں ورنہ ان کے تصورات کا اثر ہمارے اعتقاد اور یقین کو سلب کرتا چلا جائے گا، اور ہم ذہنی اور سیاسی لحاظ سے کلیتہً مغلوب ہو جائیں گے۔

ذہنی محاذ پر غیروں کا غلبہ جاری ہے

ذہنی کارزار میں فی الفور اپنی پوری قوت کے ساتھ اترنے میں پس و پیش کرنے کا سبب یا تو ہماری لاعلمی ہے کہ ہم جانتے ہی نہیں کہ ہم پر کوئی دشمن حملہ آور ہو رہا ہے اور ہمیں اپنی محافظت اور مدافعت کی ضرورت ہے اور یا پھر ہم اس حملہ کے ممکن نقصانات کا اندازہ نہیں کر سکتے اور اپنے آپ کو اس قدر مضبوط اور مستحکم سمجھتے ہیں کہ کسی مدافعت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اس وقت ہماری قوم میں جس قدر اختلافات موجود ہیں وہ غیر اسلامی نظریات کے اثر کا نتیجہ ہیں۔ اشتراکیت، قومیت پرستی، نسل پرستی

اور رسوبہ پرستی کے امراض جس حد تک ہمارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کے پھیلنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلامی تصورات کی محبت سے محروم ہو گئے ہیں کیونکہ اب تک اس محبت کی رَو کو تازہ بتازہ جسدِ ملت کے ہر ایک حصے تک پہنچاتے رہنے کے لیے ہمارے پاس کوئی نظامِ تعلیم موجود نہیں تھا اور جس حد تک ہم اسلامی تصورات کی محبت سے محروم ہوتے ہیں، اسی حد تک غیر اسلامی تصورات کی محبت ہمارے دلوں میں متمکن ہو گئی ہے۔

اگر ہم نے اپنے ملک کے لیے ایک اسلامی نظامِ تعلیم کی تعمیر میں دیر کی، تو ہم اعتقادی اور اخلاقی لحاظ سے دن بدن کمزور ہوتے چلے جائیں گے۔ کسی قوم کی اعتقادی یا اخلاقی قوت یعنی نصب العین کی محبت اس کی تمام قوتوں کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ اس پر قوم کی وحدت اور تنظیم کا دار و مدار ہوتا ہے اور اسی کی بنیادوں پر قوم کی فوجی اور اقتصادی قوتیں فروغ پاتی ہیں۔ اگر نصب العین کی محبت کمزور ہو جائے تو قوم کی ساری قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔

ذہنی غلبہ کی دوڑ

ہم چاہیں یا نہ چاہیں لیکن ہم دوسری قوموں کے ساتھ ایک ایسی دوڑ میں شریک ہیں جس میں ہر قوم نے جان کی بازی لگا رکھی ہے جو قوم اس دوڑ میں ہار جائے اس کی سزا یہ ہے کہ اسے مٹا دیا جاتا ہے اور جو جیت جائے اس کا انعام یہ ہے کہ دوسری قومیں اس کی غلام بنا دی جاتی ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہم اس دوڑ میں جیت رہے ہیں، یا ہار رہے ہیں۔ ہر دوڑ کی طرح اس دوڑ میں بھی وقت کا پہلو نہایت اہم ہے جو قوم وقت ضائع کرے گی خواہ وہ کیسی ہی طاقتور ہو، ضرور ہار جائے گی۔ اگر ہم نے وقت ضائع کیا تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ دوسروں کے تصورات اور معتقدات کا سیلاب ہمیں گھیرتا چلا جائے گا اور اگر ہم نے عجلت سے کام لیا تو ہم نہ صرف اس سیلاب سے محفوظ رہیں گے، بلکہ ہمارے اعتقادات و تصورات کا سیلاب دوسروں کو اپنے گھیرے میں لے لے گا۔ افسوس ہے کہ ہم نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح نہیں سمجھا کہ تعلیم کا معاملہ محض تعلیمی نوعیت کا نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کا ہے اور ہماری زندگی اور موت اس کے ساتھ وابستہ ہے۔

ذہنی غلامی کا نتیجہ سیاسی غلامی اور موت ہے

کسی قوم کی تاریخ میں زندگی اور موت کو پیدا کرنے والے عوامل کے اثرات چند سالوں، بلکہ بعض وقت چند صدیوں میں بھی نمودار نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود یقینی طور پر نمودار ہوتے ہیں اور ان کا اثر روکا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی قوم زندہ ہو رہی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ دنیا اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ آج کرے یا چند صدیوں کے بعد۔ دنیا ضرور اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ کرے گی۔ اسی طرح اگر کوئی قوم مر رہی ہے تو یہ معمولی بات ہے کہ لوگ اس کی موت کا نظارہ آج دیکھیں یا چند صدیوں کے بعد، اس کی موت لامحالہ دنیا کے سامنے آ جائے گی۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہم مر رہے ہیں یا زندہ ہو رہے ہیں۔ دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا ہم اپنے

اعتقادات کی حفاظت نہ کرنے سے ذہنی طور پر دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور پھر ہماری سیاسی آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی، اور یا پھر ہم اپنے معتقدات سے دوسروں کو ذہنی طور پر مغلوب کر کے ان کی سیاست پر غالب آجائیں گے۔ موت اور زندگی، اور غلامی اور آزادی کی راہوں کے درمیان دنیا کی کسی قوم کے لیے کوئی مقام نہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارا رخ کس طرف ہے۔ ذہنی آزادی کی طرف یا ذہنی غلامی کی طرف؟ زندگی کی طرف یا موت کی طرف؟ اگر آزاد ہونے کے بعد اب بھی ہم اپنے نظامِ تعلیم کو بدل کر اپنے نظریۂ زندگی کے مطابق نہیں بنا سکے تو ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نہایت ہی دل خراش اور اندوہ ناک ہے۔

کسی قوم کا امتیازی نشان جو اسے دوسری قوموں سے الگ ایک قوم بناتا ہے اور اس کی ہستی کا ثبوت ہوتا ہے اس کا اعتقاد یا اس کا تصورِ حیات ہی ہوتا ہے۔ غلامی اصل میں ذہنی غلامی ہے اور آزادی ذہنی آزادی۔ جو قوم سیاسی غلامی کے باوجود اپنے نظریۂ زندگی پر قائم رہ سکتی ہے اور اسے فی الواقع اپنے فکر و عمل کا مدار و محور بنا سکتی ہے، وہ درحقیقت آزاد ہے۔ اس کے برعکس سیاسی آزادی کے ہوتے ہوئے جس قوم کے فکر و عمل کی بنیاد غیروں کے معتقدات پر ہو، وہ آزادی کے باوجود غلام ہے۔ سیاسی آزادی کسی قوم کے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ ہر قوم سیاسی آزادی کو اپنی ذہنی آزادی کی خاطر حاصل کرتی ہے۔ خود ہم نے پاکستان کے لیے جو عظیم الشان قربانیاں دیں اس کی وجہ

یہ تھی کہ ہم چاہتے تھے کہ اپنے نصب العین حیات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ ہم ہندوؤں سے الگ ایک قوم ہونے کے مدعی اس بنا پر ہیں کہ ہمارا تصورِ حیات ہندوؤں کے تصورِ حیات سے مختلف ہے جس طرح ہر قوم کی آزادی ذہنی آزادی ہے۔ اسی طرح ہر قوم کی شکست ذہنی شکست ہے اور فتح ذہنی فتح ہے۔ کوئی قوم فوجی شکست سے اس وقت تک پریشان نہیں ہوتی، جب تک اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی شکست ہوگا اور کوئی قوم فوجی فتح سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی، جب تک اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی فتح ہوگا۔ لیکن قوموں کی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے فوجی شکست ہمیشہ ذہنی شکست پر اور فوجی فتح ہمیشہ ذہنی فتح پر ختم ہوتی ہے۔

فوجی فتح کا مقصد ذہنی غلبہ ہے

جب کوئی قوم دوسری قوم پر فوجی لحاظ سے غلبہ حاصل کرتی ہے تو وہ سب سے پہلے اس کا نظامِ تعلیم موقوف کر کے اپنا نظامِ تعلیم اس پر ٹھونستی ہے انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط جماتے ہی ہندوستان میں ایک نیا نظامِ تعلیم جاری کیا جو اُن کے اپنے مقاصد کے مطابق تھا۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک کثیر تعداد مغربی معتقدات سے متاثر ہے۔ یہی انگریزی نظامِ تعلیم اب تک ہم پر مسلط چلا آتا ہے۔ پھر گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد اتحادیوں نے جاپان، جرمنی اور اٹلی پر قبضہ کیا تو انھوں نے بھی سب سے پہلے ان ملکوں کا

نظامِ تعلیم ہی بدلا۔ پھر جب ایک ہی قوم کے اندر کوئی نئی پارٹی جو ایک نئے نظریۂ زندگی پر اعتقاد رکھتی ہو مخالف پارٹی کو شکست دے کر اندرونی انقلاب بپا کرتی ہے تو برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ملک کے نظامِ تعلیم کو بدل دیتی ہے۔ ہٹلر، مسولینی اور لینن کے بپا کیے ہوئے انقلابات کے بعد یہی ہوا۔ فاتح قوم یا فاتح پارٹی بجا طور پر سمجھتی ہے کہ جب تک مفتوح قوم یا مفتوح پارٹی اپنے معتقدات پر جمی ہوئی ہے اس کی فتح مکمل نہیں ہوتی، بلکہ ہر وقت شکست میں بدل سکتی ہے۔ یہ واقعات فطرتِ انسانی کے جن حقائق کا پتہ دیتے ہیں ان کی روشنی میں ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہندوؤں کے خلاف ہماری آزادی کی مہم جس کا ایک نتیجہ پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوا تھا مکمل طور پر کامیاب ہو گئی ہے یا نہیں؟ اور کیا اسے جس قدر کامیابی اب تک حاصل ہوئی ہے وہ محفوظ ہو گئی ہے یا نہیں؟ بلا تردد میرا جواب یہ ہے کہ اس مہم کی کامیابی ہنوز مکمل نہیں ہوئی اور جس قدر کامیابی اسے اب تک حاصل ہوئی ہے وہ بہت ہی کم ہے اور ہر وقت شکست میں بدل سکتی ہے۔

تعلیم کا مقصد نصب العین محبت کو کمال پر پہنچانا ہے

ہر شخص میں اس کی خودی کی فطرتی محبت جو تصورِ حسن یا نصب العین کے لیے مخصوص ہوتی ہے ایک خاص مقدار میں موجود ہوتی ہے۔ اس محبت کی مقدار مختلف اشخاص میں بالعموم ان کی ذہانت کی نسبت سے مختلف ہوتی ہے۔ جس قدر کوئی شخص زیادہ ذہین اور تیز فہم ہوتا ہے اسی قدر وہ اپنے نصب العین

سے زیادہ شدید محبت کر سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ذہین لوگوں کے جذبات زیادہ تیز اور قوی ہوتے ہیں۔ چونکہ خودی کی محبت کی مقدار محدود ہے اس کا جس قدر حصہ وہ ایک مقصد کے لیے صرف کرے گی دوسرا مقصد جو اس کے ماتحت نہ ہو بلکہ اس سے متناقض اور مختلف ہو اسی حد تک اس کی محبت سے محروم ہو جائے گا۔ خودی کی تربیت کے ابتدائی مراحل میں خودی کی محبت ایک سے زیادہ تصورات کے درمیان منقسم ہوتی ہے اور تصور کی محبت کمال کے اس درجہ پر نہیں ہوتی جو خودی کی فطرتی استعدادِ محبت کی رُو سے اس کے لیے پانا ممکن ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ ایک تصور خودی کی محبت کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس تصور کی محبت ترقی کرتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسی نسبت سے دوسرے تصورات کی محبت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی محبت اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے اور دوسرے تصورات کی محبت مٹ جاتی ہے۔ جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو انسان کو ایک تربیت یافتہ، متحد اور منظم شخصیت حاصل ہو جاتی ہے۔

ہر نظامِ تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس نظریۂ زندگی کے تحت وہ وجود میں آیا ہے اس کی محبت کو نقطۂ کمال پر پہنچائے اور دوسرے مخالف تصورات کی محبت کو کلیتہً مٹا دے۔ تعلیمی عمل کے دو پہلو ہیں۔ ایک کسی مخصوص تصور کی محبت کو ترقی دینا اور دوسرا اس کے مخالف تصورات کی محبت کو مٹانا، اور یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے مؤید ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ لازم اور ملزوم ہیں۔ اگر ہم ایک کو نظر انداز کریں تو دوسرا خود بخود

نظر انداز ہو جاتا ہے۔ مخالف تصورات کی محبت کا کم ہونا اور موافق تصورات کی محبت کا ترقی کرنا ایک ساتھ اور بیک وقت عمل میں آتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ہے ترازو کے ایک پلڑے کے اوپر اٹھنے سے دوسرا پلڑا خود بخود نیچے گرتا ہے جس قدر مخالف تصورات کی محبت کم ہو گی، اسی قدر موافق تصورات کی محبت ترقی کرے گی، اور اس کے برعکس جس قدر مخالف تصورات کی محبت زیادہ ہو گی اسی قدر موافق تصورات کی محبت کم ہو گی۔ جب تک ہمارے ہر فرد کے دل میں اس کے اپنے نظریۂ زندگی کی محبت کمال کے اس نقطے پر نہ پہنچ جائے جو اس کی فطرتی صلاحیتوں نے مقرر کر رکھا ہے، اس وقت تک ہم دوسرے تصورات اور اعتقادات کو اپنی محبت میں شریک کرتے رہیں گے اور اس وقت تک کمزور اور غیر متحد اور غیر منظم رہیں گے۔ ان حقائق کی بنا پر ضروری ہے کہ ہمارا نظام تعلیم اس قسم کا ہو جس سے نہ صرف طالب علم کے دل میں صحیح تصور کی محبت نشوونما پائے بلکہ جس کے تحت غلط اور مخالف تصورات کی محبت کا فروغ ناممکن ہو جائے۔ اس غرض کے لیے ضروری ہو گا کہ ہم کچھ عرصہ کے لیے ان تصورات کے اثر کو کسی راستہ سے بھی طالب علم تک نہ پہنچنے دیں۔ اور پھر جب طالب علم کو ان تصورات سے واقف کرنے کا وقت آئے تو ان کے مخالفانہ اثر کو باطل کرنے کے لیے اس کو ان کی غلطیوں اور خامیوں سے واقف کریں۔

طالب علم کے ماحول کی تشکیل ہر چیز جو مدرسہ کی فضا کی تشکیل میں حصہ لیتی ہے، خواہ ہمارے نزدیک کیسی ہی معمولی اور ناقابل اعتنا ہو طالب علم

کی نصب العینی تعلیم کا ذریعہ بنتی ہے۔ اگر ہم اسے اپنے تصورِ زندگی کی تعلیم کے لیے کام میں نہ لائیں گے تو وہ خود بخود دوسرے غلط اور مخالف تصورات زندگی کا ذریعہ بن جائے گی۔ آخر کار نہ صرف مدرسہ کی فضا بلکہ طالب علم کی زندگی کا سارا ماحول اس کی نصب العینی تعلیم (ideological education) کا ذریعہ بنتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم اس کو صحیح نصب العینِ حیات کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ضروری ہو گا کہ ہم اس کے ماحول کو نصب العین کے مطابق بنائیں۔ اس ماحول کا سب سے بڑا جزو خود ریاست ہے۔ جب تک ریاست کی ساری سرگرمیاں نصب العین کے لیے وقف نہ ہوں گی، محض مدرسہ کی فضا کو نصب العینی رنگ دینے سے طالب علم کی محبتِ نصب العین اپنے کمال پر نہ پہنچ سکے گی۔ جب وہ مدرسہ کی فضا سے باہر آئے گا تو گھر، بازار، کلب، مجلس، سینما، ریڈیو، پریس اور پلیٹ فارم (platform) سب تیار ہوں گے کہ اس کی مشکل سے جمع کی ہوئی محبت کو دوسرے تصورات کے سپرد کر دیں۔ طالب علم کے ماحول کو ممکن حد تک تصرف میں لانے کے لیے ہی یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ رہائشی مدرسوں (residential institutions) کے ذریعہ سے اس کے دن رات کے تمام مشاغل کی نگرانی کی جائے لیکن رہائشی اداراتِ تعلیم طالب علم کے سارے ماحول کو تصرف میں نہیں لا سکتے جب تک کہ خود ریاست اپنی ساری سرگرمیاں کلیۃً نصب العین کے لئے وقف نہ کرے۔

میرے اس فقرے پر کہ ہمارے لیے ضروری ہو گا کہ ہم کچھ عرصہ کے لیے

آزادی رائے اور رواداری کے اصول مخالف اور غلط تصورات کے اثر

کو کسی راستے سے بھی طالب علم تک نہ پہنچنے دیں۔" شاید وہ حضرات جو آزادیٔ رائے کے متعلق بعض مغربی اقوام کے غلط پراپیگنڈا سے متاثر ہیں چیں بجبیں ہوں کہ یہ تو وہی انسان کی ذہنی نشوونما کو روک دینے والی غلامی ہے جو بعض فسطائی حکومتوں نے لوگوں پر مسلط کر رکھی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہر قوم آزادیٔ رائے کا نام اسی وقت تک لیتی ہے جب تک کہ وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے غلط اور صحیح رائے میں تمیز کرنے سے قاصر ہوتی ہے اور نہیں جانتی کہ کون سی رائے اس کے قومی نصب العین کو کمزور کرنے والی ہے اور کون سی نہیں، اور سچی بات یہ ہے کہ اس وقت تک ہر قوم خود اپنے نصب العینِ حیات کی رُو سے آزادیٔ رائے کا ڈھنڈورا پیٹنے میں حق بجانب بھی ہوتی ہے اور اسے اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ جب تک کوئی شخص اپنی منزلِ مقصود کو نہیں پہچانتا، اور نہیں جانتا کہ وہ کس سمت کو چل کر وہاں پہنچ سکتا ہے اس وقت تک اگر وہ چلتے چلتے کسی رکاوٹ سے ٹھوکر کھا کر دائیں یا بائیں طرف مڑ جائے، یا مخالف سمت میں چلنے لگ جائے تو اسے شکایت کا حق نہیں پہنچتا، اور نہ اس کے دل میں کوئی شکایت پیدا ہی ہوتی ہے۔

تمام قوموں سے زیادہ جمہوریت اور آزادی کا نام لینے والی قوم امریکہ ہے لیکن آج امریکہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ اشتراکیت کا تصور اس کے نصب العینِ حیات کا مخالف ہے۔ لہٰذا آج امریکہ کی حکومت ان امریکنوں کے ساتھ جن کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اشتراکی افکار کے ساتھ ہمدردی رکھتے

ہیں جو برتاؤ کر رہی ہے وہ دنیا کے سامنے ہے۔ ہیرالڈ جے لاسکی (Harold J. Laski) سچ کہتا ہے کہ اگر روس جمہوری سرمایہ داری افکار کو بورژوا تصورات کے نام سے دباتا ہے تو امریکہ اشتراکی افکار کو بے راہ روی (license) کے نام سے دباتا ہے۔ آزادیٔ رائے دراصل دونوں کے ہاں مفقود ہے۔

جب آئن سٹائن (Einstein) جرمنی سے بھاگ کر امریکہ آیا تو امریکہ کے نام نہاد جمہوریت اور آزادی کے پرستاروں نے شور برپا کر دیا کہ ہٹلر کی جرمنی میں سائنس دانوں کو بھی آزادی حاصل نہیں۔ لیکن اب وہی آئن سٹائن ہے جو اشتراکیت نوازی کے الزام میں امریکی حکومت کے زیرِ عتاب ہے۔ گزشتہ فروری کے مہینہ میں امریکی حکومت نے ڈاکٹر بائس (Dr Bois) ایک مشہور امریکی پروفیسر اور مصنف کو اس الزام میں پکڑ لیا تھا کہ وہ مرکزِ اطلاعاتِ امنِ امریکہ کا (Press Information Centre of U.S.A.) کا صدر رہ چکا ہے اور حال ہی میں حکومتِ انگلستان نے ایک روسی فلم ڈائرکٹر اور ایک چینی شاعر کو اس بنا پر انگلستان آنے کی اجازت نہیں دی کہ وہ انگلستان کی مجلسِ امن (British Peace Committee) کے ایک اجلاس میں بطور مندوبین کے شریک ہو رہے ہیں۔ ہم مغرب کے پراپیگنڈا سے بہت جلد فریب کھا جاتے ہیں۔ کوئی قوم مشرق میں رہتی ہو یا مغرب میں اپنی فطرت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ دنیا کی کوئی قوم اپنے نصب العینِ حیات کے خلاف کوئی اقدام گوارا نہیں کر سکتی، خواہ وہ اپنوں کی طرف

سے ہو، اور خواہ بیگانوں کی طرف سے، اور اسے گوارا ہی کرنا چاہیے۔

جو افکار و آرا صحیح تصورِ حیات کے نقیض اور مخالف ہوں، اور ان سے لوگوں کے اعتقاد اور یقین کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم ان کی نشر و اشاعت کو سختی سے روک دیں۔ ہر راہِ عمل خواہ انسان اسے دوسروں کے دباؤ کے بغیر خود بخود اختیار کرے، آزادی کی راہ نہیں ہوتی۔ فرد کو آزادی صرف ایک راہ پر حاصل ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ باقی جس قدر راہیں ممکن ہیں وہ سب غلامی کی راہیں ہیں۔ آزادی کا راستہ وہی ہے جس پر چل کر خودی اپنے فطری نفسیاتی رجحانات کو مطمئن کر سکتی ہے جو اس کی تربیت اور ترقی اور مکمل تصورِ حسن کی جستجو کا راستہ ہے۔ جونہی خودی اس راستے کو چھوڑتی ہے خواہ وہ اسے خود بخود بغیر کسی دباؤ کے چھوڑے، وہ اپنے مخالف تصورات کی غلام ہو جاتی ہے، گو وہ اپنی جہالت سے اسے آزادی ہی سمجھتی رہے۔

اگر ہم نارواداری کا صحیح استعمال جانتے ہوں تو وہ مفید ہے مضر نہیں۔ تعلیم کا حاصل یقین اور اعتقاد کی نشو و نما ہے۔ یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ہم ایک طرف سے تو یقین و اعتقاد کی تعمیر کریں اور اس کی تعمیر کے لیے سو طرح کی مصیبتیں اٹھائیں اور دوسری طرف سے جو کچھ تعمیر کریں اسے گراتے چلے جائیں، اس بڑھیا کی طرح جو دن بھر سوت کاتتی ہے اور شام کو اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ نارواداری تعلیم ہی کا ایک جزو ہے اور اسی کا ایک پہلو ہے جس سے تعلیم کے فوائد محفوظ کیے جاتے ہیں۔ اگر ایک غذا زہر آلود بھی ہو

تو اس پر بھروسہ کر کے جسم کے اندر زہر کا ٹیکہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر ہم مریض کا علاج ضروری سمجھتے ہوں تو ہمیں پرہیز کو بھی ضروری سمجھنا چاہیے۔

انسان ابھی خود شناسی کے ابتدائی مراحل میں ہے

در اصل اس وقت آزادیٔ رائے اور رواداری کے حق میں اور غلامیٔ رائے اور نارواداری کے خلاف جس قدر پراپیگنڈا دنیا میں موجود ہے اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ابھی تک انسان اپنے آپ کی واقفیت کے بالکل ابتدائی مراحل میں سے گزر رہا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اس کی خودی کے اصلی اور صحیح تقاضے کیا ہیں اور نفسیاتی سطحِ حیات پر کون سی چیز اس کے لیے مفید ہے اور کون سی مضر۔ آئندہ جب فطرتِ انسانی کے علم کی ترقی سے یہ مشکل رفع ہو جائے گی اور اس بات کی واقفیت خواص کے دائرہ سے نکل کر عوام تک جا پہنچے گی کہ انسان کی زندگی کا مقصد یا دوسرے لفظوں میں کامل ترین تصورِ حیات کیا ہے تو ہم افکار و آرا کے معاملہ میں فرد کی بہتری کے لیے اور نیز اس جماعت کی بہتری کے لیے جس کا وہ رکن ہے فرد کے ساتھ ضروری حد تک سختی کا برتاؤ کرنا اپنا مقدس فریضہ سمجھیں گے۔ آج ہم کو حفظانِ صحت کے قوانین کی یقینی واقفیت حاصل ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم ان قوانین کا جبری نفاذ کرتے ہیں۔ ایک مہذب ملک میں جو شخص شہر کی سڑک پر نجاست پھینکتا ہوا پکڑا جائے اس کی جگہ قید خانہ تجویز کی جاتی ہے اور اس پر کسی کو تعجب نہیں ہوتا۔ خودی کے علم کی ترقی کا ایک دور ایسا بھی آنے والا ہے جب ہم خودی کی صحت اور تندرستی کے قوانین پر بھی اسی یقین اور اعتقاد کے ساتھ

حاوی ہوں گے جس طرح سے آج ہم جسم کی صحت اور تندرستی کے قوانین پر حاوی ہیں۔ پھر وہ شخص جو ایک مجمع عام میں قومی استعماریت (National imperialism) یا جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کے حق میں تقریر کرے گا، ہمیں ایسا ہی نظر آئے گا، جیسے کوئی شخص شہر کی صاف ستھری سڑکوں پر نجاست بکھیر رہا ہو، اور اگر اسے قید خانہ میں بھیج دیا جائے گا تو کسی کو تعجب نہیں ہوگا۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم طالب علم کو تمام غیر اسلامی بیرونی تصوّرات سے

باطل تصوّرات کی واقفیت طالب علم کی تربیت کے لیے ضروری ہے

الگ کر کے ایک ثقافتی جزیرہ کے اندر اس کی تربیت کریں۔ طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کے ایک مرحلہ پر ہر قسم کے اچھے اور بُرے تصوّرات سے تعارف پیدا کرے۔ لیکن یہ اسی وقت ہونا چاہیے جب اس کے اپنے نصب العین کی محبت اور اس کی ذہنی قوتیں اس حد تک ترقی کر چکی ہوں کہ وہ غلط تصوّرات کو غلط اور صحیح کو صحیح سمجھ سکے۔ اور پھر استاد کو چاہیے کہ طالب علم کو نیک و بد تصوّرات کا تعارف کرانے کے بعد نیک کو بد سے تمیز کرنے میں اس کی مدد کرے یعنی اس کی تحقیق و تنقید اور فہم و ادراک کی قوتوں کی رہنمائی اس طرح کرے کہ وہ خود بخود اچھے تصوّرات کو بُرے تصوّرات سے تمیز کر سکے۔ ہمیں ہر حالت میں اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ غلط تصوّرات سے اس کے اپنے اعتقاد کو نقصان نہ پہنچے بلکہ اس کا اعتقاد اور مضبوط اور مستحکم ہو جائے۔

اگر اپنے نصب العین سے پیدا ہونے والے تصوّرات کے علاوہ باقی تمام نصب العینوں سے پیدا ہونے والے افکار و آرا کو کلیتہً مسدود کر دیں، تو طالب علم کی ذہنی نشو و نما رک جائے گی اور اس کے اپنے نصب العین کا علم بھی ترقی نہیں کرے گا اور اس کی تربیت پر بُرا اثر پڑے گا۔ صداقت کا علم کبھی اتنا واضح اور صاف نہیں ہوتا جتنا کہ اس وقت ہوتا ہے، جب ہم صداقت کو دروغ کے مقابلے پر لائیں۔ اگر ہم تاریکی سے نا آشنا ہوتے تو روشنی ہمارے لیے ایک بے معنی چیز ہوتی۔ اس دنیا میں حق و باطل کی آمیزش ہر جگہ موجود ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو دونوں میں تمیز کرنے اور حق کو اپنانے اور باطل کو ترک کرنے کی طرف رہنمائی کریں۔

ہم میں سے بعض درد دل رکھنے والے اشخاص جب اپنی قومی سیرت کی

سیرتِ قومی کے نقائص کا علاج

کمیوں اور کوتاہیوں کو دیکھتے ہیں تو بہت کڑھتے ہیں۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ دوسری قوموں کی نسبت ہم اپنی حیوانی یا جبلتی خواہشات کی خاطر قومی، ملی یا نصب العینی مفاد کو نظر انداز کرنے کے لیے بہت جلد آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دوسری قوموں کی نسبت ہم میں غدار، رشوت خوار، دوست نواز، نسل پرست، جاہ طلب، صوبہ پرست، خاندان پرست، مسرف، حریص اور اخلاق باختہ افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ اگرچہ یہ صورت حال افسوس ناک ہے لیکن ہمیں نا امید یا پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں

اس لیے کہ یہ سب ایک ہی مرض کی علامتیں ہیں اور ان کا علاج آسان ہے یہ مرض نصب العین کی محبت کا انحطاط ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ غلامی کی وجہ سے ہم مدتِ دراز سے اپنی قوم کی تعلیم و تربیت اپنی مرضی کے مطابق نہیں کر سکے ہیں اب تک اس کی تعلیم و تربیت غلط طور پر ہوتی رہی ہے اس غلط تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہماری قوم کے افراد کے دلوں میں ان کے اپنے نصب العین کی محبت کی بجائے دوسرے نصب العینوں کی محبت پرورش پاتی رہی ہے۔

انگریزی کا نظام تعلیم ہمارے دلوں میں اسلامی تصورات کو کمزور کر کے مغربی قومیت کے تصورات کی نشوونما کرتا رہا ہے۔ اگرچہ وہ اسلامی اعتقادات کی محبت کو پوری طرح نہیں مٹا سکا لیکن اس کو بے حد کمزور کر گیا ہے اور اگرچہ وہ مغربی تصورات کی محبت کو پوری طرح سے غالب نہیں کر سکا لیکن اس کو بے حد طاقتور کر گیا ہے۔ اب ہم نہ تو پکے مسلمان رہے ہیں اور نہ ہی پکے مغربی قومیت پرست۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قومی سیرت جو اسلامی نصب العینِ حیات کے تحت ہندوؤں یا انگریزوں کی سیرت سے زیادہ بلند اور پختہ ہونی چاہیے تھی، اب ان سے بھی پست تر ہے، اگرچہ ہندو بھی ہماری طرح انگریزی نظام تعلیم کے زیرِ اثر رہے ہیں، لیکن ان کے ہاں وہ صورت پیدا نہیں ہوئی جو ہمارے ہاں پیدا ہوئی ہے۔ ہندوؤں کے ہاں مغربی قومیت پرستی کے تصورات انگریزی نظام تعلیم کی بدولت مکمل فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے

ہیں کیونکہ ہندوؤں کے نصب العینِ حیات میں اسلامی انداز کی کوئی چیز ان تصورات کے مقابلے پر موجود نہیں تھی۔

جب مرض کی نوعیت، اس کی علامات اور اس کا سبب واضح طور پر معلوم ہوں تو اس کا علاج آسان ہوتا ہے۔ نصب العین کی محبت کا زوال ہمارا اصل مرض ہے۔ ہماری اخلاقی کوتاہیاں اس کی علامات ہیں۔ غلط اور غیر اسلامی نظامِ تعلیم اس کا سبب ہے۔ للہٰذا اس کا علاج صحیح اور اسلامی نظامِ تعلیم ہے۔ اب جب کہ ہم آزاد ہیں ہم اس علاج پر قدرت رکھتے ہیں۔ اب ہم اپنے نظامِ تعلیم کو بدل کر اپنی قومی سیرت کو جس قدر چاہیں بلند کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس علاج سے اب بھی غافل رہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بیماری اور نقاہت کو صحت اور طاقت پر ترجیح دے رہے ہیں۔

اسلامی نظامِ تعلیم سے کیا مراد ہے

اسلامی نظامِ تعلیم سے میری مراد ایسا نظامِ تعلیم نہیں جس میں اسلامی نظریۂ حیات دینیات یا اسلامیات کے نام سے ایک جز کے طور پر موجود ہو، بلکہ ایسا نظامِ تعلیم جو خود اسلامی نظریۂ زندگی کا ایک جز ہو جس کا مقصد اسلامی نظریۂ زندگی کی تائید اور اعانت کے سوائے اور کچھ نہ ہو، جس میں علم سے مراد اسلامی نظریۂ انسان و کائنات ہو اور علم کی تینوں شاخیں یعنی مادی علوم، حیاتیاتی علوم اور نفسیاتی علوم اس نظریہ کی شاخیں بھی جائیں۔

قرآن نے اسلام کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ انسان کی فطرت ہے اور انسانی فطرت کا کوئی تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک

وہ ساری کائنات کا تصور نہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ قرآن نے ارشاد کیا ہے کہ وہ کائنات کے اسرار پر حاوی ہے:

قل انزلہ الذی یعلم السر فی السموٰت والارض۔

کہو اس کتاب کو اس ذات پاک نے نازل کیا ہے جو زمین اور آسمان کے بھید جانتا ہے۔

کائنات کے تین طبقے ہیں۔ مادّہ، حیوان اور انسان۔ انسان کے اندر یہ تینوں طبقے موجود ہیں۔ لہٰذا انسان چھوٹے پیمانے پر ایک کائنات ہے اگر ہم انسان کو پوری طرح سمجھ لیں تو گویا ہم نے ساری کائنات کو پوری طرح سمجھ لیا اور انسان اور کائنات میں سے اگر ہم کائنات کو پوری طرح سمجھ لیں تو پھر انسان کی حقیقت بھی پوری طرح ہماری سمجھ میں آجائے گی پھر انسان اور کائنات میں سے جس قدر ہماری واقفیت ایک کے متعلق بڑھے گی، دوسرے کے متعلق بھی اسی نسبت سے بڑھے گی۔ علوم کی تین شاخیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے انسان یا کائنات کے تینوں طبقوں کے علوم ہیں۔

کوئی حقیقی علم یعنی کوئی سچائی یا صداقت اسلام کے خلاف نہیں جا سکتی۔ کیونکہ اسلام بھی صداقت ہے اور صداقت غیر منقسم ہے اس کی ایک سے زیادہ قسمیں یا ایک سے زیادہ حصے نہیں ہو سکتے۔ حق خدا کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ خدا سچ ہے۔ لہٰذا صداقت خود خدا کا علم ہے۔ اور چونکہ خدا ایک ہے صداقت بھی ایک ہی ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ کوئی شخص کافر ہو یا مسلمان، کوئی علمی صداقت ایسی دریافت

نہیں کر سکتا جو اسلام کی تائید نہ کرتی ہو اور جس کی تائید اسلام نہ کرتا ہو۔ یہی سبب ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا:

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن فحیث وجدھا فھو احق بھا

دانائی کی بات یعنی صداقت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ جہاں پائے اسے لے لے۔

لیکن کسی علمی صداقت اور اسلام کی مطابقت کی شرط یہ ہے کہ جس چیز کو ہم صداقت کہہ رہے ہوں وہ فی الواقع صداقت ہو اور وقت گزرنے اور علم کے ترقی پانے سے وہ اور مضبوط، مستحکم اور روشن ہو رہی ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جس چیز کو ہم اسلام کہہ رہے ہوں وہ فی الواقع اسلام ہو اور قرآن کے مطالب کے بارے میں فقط ہماری غلط فہمیوں اور غلط بینیوں کا دفتر نہ ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو علمی صداقت سمجھ لیتے ہیں اور وہ صداقت نہیں ہوتی۔ اور ایسا بھی اکثر ہوتا ہے کہ ہم اپنی لاعلمی سے قرآن کی غلط تشریح کرتے ہیں اور اسی کو قرآن یا اسلام سمجھ لیتے ہیں۔

علوم کو دوبارہ مدون کرنے کی ضرورت

اس قسم کے اسلامی نظام تعلیم کی مکمل تعمیر کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم موجودہ انسانی اور نفسیاتی علوم پر نظر ثانی کر کے ان کو قرآن کی روشنی میں نئے سرے سے مدون کریں۔ کیونکہ ان علوم کی صحیح تدوین کا دارومدار فطرت انسانی کے صحیح نظریہ پر ہے جس سے مغرب کے حکما بے خبر ہیں۔ چونکہ انھوں نے ان علوم کو فطرت انسانی کے غلط نظریہ پر مبنی کر رکھا ہے، لہٰذا ان کی ساری تحقیق غلط طور پر ہوئی ہے۔ میں نے ان کے ساتھ مادّی اور حیاتیاتی علوم کو شامل نہیں کیا

کیونکہ ان علوم میں کسی کافر کے لیے بھی بھٹکنے کی گنجائش نسبتاً کم ہے۔ تاہم جب ہم نفسیاتی علوم کی تدوین سے فارغ ہو جائیں تو ہمیں حیاتیاتی علوم پر بھی نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ وہ بھی صحیح اور اسلامی زاویۂ نگاہ سے مدوّن ہو جائیں۔ حیاتیاتی علوم پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے ہمیں نظر آئے گا کہ اکثر مقامات پر حیاتیاتی عمل کی علت کو ٹھیٹھ علمی بصیرت سے سمجھنے میں کفار نے غلطیاں کی ہیں اور ہم اس قابل ہیں کہ خالص علمی نقطۂ نگاہ سے ان غلطیوں کا ازالہ کر سکیں۔

تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ علوم کی نئی تدوین کے بغیر ہم اس قسم کا اسلامی نظامِ تعلیم جاری نہیں کر سکتے۔ بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم کا اجرا علوم کی نئی تدوین میں مدد کرے گا اور جب تک اسلامی نظامِ تعلیم جاری نہیں ہوگا ہمیں علوم کی نئی تدوین کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی، اور نہ اس کام میں ضروری سہولتیں پیدا ہوں گی۔

میرے خیال میں اسلامی نقطۂ نظر سے تدوینِ علوم کی مہم کے آغاز کے طور پر ہماری یونیورسٹیوں کو فی الفور اس بات کا اعلان کرنا چاہیے کہ تمام علوم جو اس میں پڑھائے جاتے ہیں اسلامی نظریۂ کائنات کی شاخیں ہیں اور ہر طالب علم اور استاد کو انھیں اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا اور پڑھنا اور پڑھانا چاہیے۔ اس سے ایک حیرت انگیز نفسیاتی انقلاب ہوگا اور قرآن کے متعلق ہمارا جامد اور متحجر نقطۂ نظر فوراً بدل جائے گا

اور ہم قرآن کو ایک نئی، سچی اور صحیح روشنی میں دیکھنے لگیں گے۔ اس قسم کے اسلامی نظامِ تعلیم میں اسلامیات کو ایک الگ مضمون کے طور پر رکھنا ضروری ہوگا۔ لیکن موجودہ نظامِ تعلیم میں ایک الگ مضمون کے طور پر اسلامیات کا جوڑ وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا جو ہمارے مدِنظر ہیں۔ بلکہ اس سے یقینی طور پر برعکس نتائج پیدا ہوں گے۔ کیونکہ اس سے طالب علم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ اسلام کا علم زیادہ سے زیادہ علم کا ایک الگ شعبہ ہے جو ہر حالت میں نقل پر مبنی ہے اور اس قسم کا عقلی علم نہیں، جیسا کہ اسے بعض دوسرے مضامین کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے اور پھر وہ اپنے اس خیال کا اطلاق اپنی عملی زندگی پر بھی کرے گا اور سمجھے گا کہ مذہب اس کی زندگی کا ایک حصہ ہے اور اس کی ساری زندگی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام اور اسلامی زندگی کے متعلق طالب علم کا یہ نقطۂ نظر جو ہم اسلامیات کو یونیورسٹی کا ایک الگ مضمون قرار دینے سے پیدا کریں گے اسلامی نظریۂ زندگی کی محبت کی نشو و نما کے لیے سازگار نہیں ہوگا۔ حالانکہ ہم چاہتے ہیں اور ہم اپنے نظامِ تعلیم کا یہ واحد مقصد اور مدعا قرار دیتے ہیں کہ طالب علم کی محبت نہ صرف نشو و نما پائے، بلکہ نشو و نما پا کر نقطۂ کمال پر پہنچے۔

علمی تحقیق کا نقطۂ آغاز

اس قسم کا اسلامی نظامِ تعلیم علمی تحقیق اور انکشاف کے لیے ایک نہایت ہی سازگار ماحول پیدا کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علمی تحقیق کی راہ نمائی ہمیشہ مفروضات سے

ہوتی ہے جن کو ہم اپنے وجدان سے قائم کرتے ہیں۔ ہم ایک مفروضہ لے لیتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ یہ حقائق کے ساتھ منطبق ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ ایسا کرے تو ہم اسے صحیح سمجھتے ہیں اور پھر مزید حقائق کے انکشاف سے اس کی تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر کوئی مفروضہ (hypothesis) علمی حقائق کے ساتھ منطبق نہ ہو، یا ان میں تنظیم اور وحدت پیدا نہ کر سکے تو ہم اسے غلط سمجھتے ہیں اور دوسرے مفروضہ کی آزمائش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں ایک ایسا مفروضہ ہاتھ آجاتا ہے جس کی صحت کے متعلق ہمیں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ جب تک ہمیں صحیح مفروضہ نہیں ملتا ہم حقائق کو ایک غلط مفروضہ کی لڑی میں پروئے رکھتے ہیں اور ہماری تحقیق غلط رہتی ہے۔ جدید علم طبیعیات کے حقائق ایسے ہی صحیح یا غلط مفروضات پر مبنی ہیں حتیٰ کہ وہ حقائق بھی جن کی مدد سے ہم نے سالمہ کو شق کیا ہے اور جن کی صداقت سالمہ کے انشقاق سے پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔ ڈارون کا مادّی اور میکانکی (mechanical) نظریۂ ارتقا بھی ایک ایسا ہی مفروضہ ہے جسے مغرب کے اکثر حکما نے انسانی اور حیاتیاتی علوم کی تحقیق کا نقطۂ آغاز بنایا ہے۔ چونکہ یہ مفروضہ غلط تھا اس لیے ان علوم میں مغربی حکما کی تحقیق کے سارے نتائج غلط ہو گئے ہیں اس کے برعکس اگر ہم اسلامی نظریۂ کائنات کو ایک مفروضہ سمجھ کر اس مفروضہ سے ان علوم میں اپنی تحقیق کا آغاز کریں گے تو ہم صحیح نتائج پر پہنچیں گے کیونکہ ہمارا مفروضہ صحیح ہوگا۔ ایک لفظ میں اسلامی نظریۂ کائنات جو

ہماری علمی تحقیق کا نقطۂ آغاز ہوگا یہ ہے کہ خدا انسان اور کائنات کا خالق ہے اور ایک مدعا کے تحت قولِ کن سے غیر مبدل قوانین کی تخلیق کرتا ہے:

لا یبدل القول لدی۔

میری بات بدلتی نہیں

یہ مفروضہ ہمیں علمی تحقیق میں ان غلطیوں سے بچائے گا، جن کی وجہ سے انسانی، اجتماعی اور حیاتیاتی علوم میں بالخصوص حکمائے مغرب کی تحقیق مضحکہ خیز بن گئی ہے۔ خودیٔ کائنات علم کی ابتدا اور انتہا ہے جو حکیم اپنی علمی تحقیق کا آغاز یہاں سے نہیں کرتا وہ لازماً کسی اور مفروضہ سے اس کا آغاز کرے گا اور پھر چونکہ اس کی خشتِ اول ہی غلط ہوگی، اس لیے اس کی تحقیق کی دیوار اگر ثریا تک بھی جائے گی تو ٹیڑھی ہی رہے گی۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا انظام تعلیم علمی اور عقلی لحاظ سے صحیح ہو تو ضروری ہے کہ اس کی بنیاد صحیح ہو اور صحیح بنیاد اسلامی نظریۂ کائنات کے سوائے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ فی الواقع اسلامی نظریۂ کائنات علم ہے اور علم کی مختلف شاخیں اس کی مختلف شاخیں ہیں۔ جو نظریۂ کائنات بھی صحیح ہوگا وہی علم ہوگا اور علم کی مختلف شاخیں اس کی شاخیں ہوں گی۔

روس کی مثال

اس بارے میں ہمیں روس کے کفار سے سبق لینا چاہیے۔ روسیوں کا نظریۂ کائنات جدلی مادیات (Dialectical Materialism) کہلاتا ہے روسی جدلی مادیت کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اسی کو علم اور علم کی تمام

شاخوں کو اس کی شاخیں قرار دیا ہے۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ علم کے ہر شعبے میں جو نئے انکشافات ہوں گے وہ فلسفۂ جدلی مادیات کی تائید کریں گے۔ جب ایسا نہیں ہوتا تو وہ سائنس دان پر الزام عائد کرتے ہیں کہ جدلی مادیات کے مذہب پر اس کا یقین پختہ نہیں، اور اس کا ضعفِ اعتقاد اس کے بھٹکنے کا موجب ہوا ہے۔ لہٰذا وہ اسے قابلِ تعزیر سمجھتے ہیں اور اس کی تعزیر اکثر اوقات موت ہوتی ہے۔ ہم سائنس دان کو تعزیر کرنے کی حد تک تو نہ جائیں کیونکہ ہمیں یقین ہے، اگر کسی وقت ایک سائنس دان کی تحقیقات کے نتائج اسلام کے حق میں نہیں ہوں گے تو دوسرے سائنس دان کی تحقیقات سے بالآخر اس کی غلطی کا ازالہ ہو جائے گا۔ لیکن ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیے کہ علم درحقیقت اسلامی نظریۂ کائنات کا نام ہے اور اس غلط نظریۂ کائنات کا نام نہیں جسے جدلی مادیات کہا جاتا ہے اور یہ ہمارا ہی حق تھا جسے روسی ناجائز طور پر کام میں لا رہے ہیں:

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

روسی نہ صرف جدلی مادیات کو اپنے نظامِ تعلیم کی اساس قرار دیتے ہیں بلکہ اس فلسفہ کو سکولوں اور کالجوں میں ایک الگ مضمون کے طور پر بھی پڑھاتے ہیں جو لازمی ہوتا ہے بلکہ وہاں کوئی شخص اس وقت تک ریاست کی اعلیٰ ملازمتوں میں نہیں لیا جاتا، جب تک وہ ایک ایسے امتحان میں شامل ہو کر کامیاب نہ ہو، جس میں جدلی مادیات ایک لازمی مضمون ہے

جو امیدوار اس مضمون میں ناکام ہو جاتا ہے وہ سارے امتحان میں ناکام سمجھا جاتا ہے۔

مارکسی فلسفی کتاب (A Text-Book of Marxist Philosophy) کو روس کے بڑے بڑے علمائے جدلی مادیات نے مل کر مدوّن کیا ہے اس کے مصنفین کتاب کے دیباچہ میں فلسفۂ جدلی مادیات کی تعلیم کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"روسی جانتے ہیں کہ ایک انسان کا نظریۂ کائنات اہمیت رکھتا ہے اور وہ لوٹ کھسوٹ اور طلبِ منفعت کے پیچھے ایک مثبت قوت کے طور پر موجود ہو سکتا ہے۔ تم سماجی مرض کا ازالہ اس وقت تک نہیں کر سکتے، جب تک اپنی سیاسی اور صنعتی تجاویز کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری نظریۂ کائنات کی تردید نہ کرو اور اس کے عوض میں کوئی دوسرا نظریۂ کائنات بہم نہ پہنچاؤ، وہ جس نظریہ کا انکار کرتے ہیں، انھیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر کیا کیا مغالطے ہیں، اور ان کے پاس ان کا اپنا نظریۂ کائنات ہوتا ہے جو ہر چیز کو دیکھنے کے لیے انھیں روشنی بخشتا ہے۔"

ایک روسی چیسٹرٹن (Chesterton) کے ساتھ متفق ہے کہ عملی نقطۂ نگاہ سے ایک انسان کے بارے میں اہم ترین چیز اس کا نظریۂ کائنات ہے تاریخ میں کوئی بڑی تحریک ایسی جاری نہیں ہوئی جو ایک فلسفیانہ تحریک نہ تھی۔ عظیم الشان نظریاتِ کائنات کے وجود میں آنے کا وقت ہی عظیم الشان نتائج کے وجود میں آنے کا وقت ہوتا رہا ہے۔ کوئی شخص فلسفے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جو شخص سمجھتا ہے کہ وہ فلسفی نہیں وہ درحقیقت ایک

اچھا فلسفی نہیں۔

یہی نقطۂ نظر ہمیں اسلامی نظریۂ کائنات کے متعلق اختیار کرنا چاہیے۔

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات

طوبیٰ ریسرچ لائبریری

اسلامی اردو، انگلش کتب،

تاریخی، سفرنامے، لغات،

اردوادب، آپ بیتی، نقدوتجزیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com